شناسا ادبی چہرے

ملک مقبول احمد

شناسا ادبی چہرے

ملک مقبول احمد

مقبول اکیڈمی
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور

اشاعت اول ستمبر 2013ء

اہتمام ________ ملک مقبول احمد

ناشر ________ مقبول اکیڈمی

مطبع ________ طارق پریس لاہور

سرورق ________ انیس یعقوب

قیمت ________ =/ 500 روپے

ادب اور ادیب کا سچا ثناء خواں

جناب افتخار مجاز

☆☆☆

ممتاز ادیب، صحافی اور دانشور

جناب تنویر ظہور

☆☆☆

ادیب دوست مؤرخ

جناب ایم آر شاہد

اور

پیکر خلوص و محبت

علامہ عبدالستار عاصم

کے نام

جو ادب کے آفاق پر ستاروں کی طرح

جگمگا رہے ہیں

☆☆==☆==☆☆

فہرست

شناسا ادبی چہرے

☆☆☆

پیشِ لفظ

میں نے اپنی کتاب "۵۰ نامور ادبی شخصیات" جنوری ۲۰۱۱ میں اہلِ ادب کی خدمت میں پیش کی تھی تو میرے دل میں یہ خدشہ موجود تھا کہ اس کتاب میں شامل شخصیات کے اوصاف جمیلہ اور ان کے کردار کی جہات حسنہ کا احاطہ میرا کمزور قلم نہیں کر سکا۔ اس وقت میری کم علمی میرے آڑے آتی رہی اور مجھے سمجھاتی رہی کہ تم جگنو ہو لیکن آفتابوں پر کمندیں ڈال رہے ہو۔ میرا یہ احساس اب بھی میرے دل میں موجود ہے لیکن مجھے خوشی تھی کہ "سفر جاری ہے" کی طرح میری اس کتاب کو بھی پذیرائی حاصل ہوئی بلکہ متعدد دوستوں نے اس سلسلے کو آگے بڑھانے کا مشورہ بھی دیا اور زیر نظر کتاب ان کے ارشاد کی تعمیل ہے۔

اس کتاب میں بھی حسب سابق میں نے اس مواد سے استفادہ کیا ہے جو میرے کرم فرماؤں نے میری استدعا پر مجھے فراہم کیا۔ اور میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ میرے قلم پر معلوماتی اعتبار سے وہی باتیں اتری ہیں جو مجھے بتائی گئی تھیں اور اس طرح

اس کتاب میں شامل سب شخصیات اس کی تالیف میں شامل ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر شخصیت نے اپنے کردار کا کوئی خوبصورت زاویہ میرے دل پر اس طرح نقش کیا کہ میں ان کی عظمت کا اسیر ہو گیا اور پھر میں نے اپنے اس تاثر کو ہی اس کتاب میں رقم کرنے کی کوشش کی۔ میں ادیب کو آسمانی مخلوق تو نہیں سمجھتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک تخلیق کار عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے طور طریقوں اور آداب معاشرت سے الگ پہچان بھی رکھتا ہے۔ میرا مشاہدہ یہ بھی ہے کہ ہر ادیب اپنی ذات میں انفرادیت کے مقام پر فائز ہے۔ فیض احمد فیض، میرزا ادیب، پروفیسر جمیل آذر احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا اور منیر نیازی سب نامور اور ممتاز ادیب ہیں لیکن ان میں سے ہر ادیب کے خصائص الگ اور انفرادیت کے گوشے مختلف ہیں۔ یہی حال اس کتاب میں شامل سب ادیبوں کا ہے۔ میں ان کی شخصیت شناسی کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ ہر ادیب اپنی شخصی اکائی سے ہی اپنی پہچان بتاتا ہے اور میں نے اس کتاب میں مختلف اکائیاں جمع کرنے کی کاوش کی ہے۔ یہ تمام تر میرے ذاتی مشاہدے کے نتائج ہیں۔ میں توقع کرتا ہوں کہ آپ اس کتاب کو بھی حسب سابق شرفِ پذیرائی عطا کریں گے۔

میں اپنے دوستوں محترم سعید بدر، علی سفیان آفاقی، ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر جمیل آذر، علامہ عبدالستار عاصم، مقصود چغتائی، محمد آصف بھلی، میجر غلام نبی اعوان، شبیر حسین شاہ زاہد اور ڈاکٹر غفور شاہ قاسم کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری حوصلہ افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ یہ کتاب چھپ رہی ہے اور میرے عزیز ترین دوست اظہر جاوید اس دنیا میں موجود نہیں، وہ میرے معمولی کام کے سب

سے بڑے قدر دانی تھے۔ اب وہ نظر نہیں آتے تو میری آنکھوں میں انسو اتر آتے ہیں حق تعالے ان کی مغفرت کرے۔

ملک مقبول احمد

حرفِ آغاز

انسان جب تک کوئی کام شروع نہیں کرتا اس وقت تک نہ تو خود اس کو اور نہ ہی دوسروں کو اس کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کا علم ہو سکتا ہے۔ ملک مقبول احمد کے ساتھ بھی ایسا ہی حادثہ پیش آیا۔ لڑکپن میں وہ اپنے گاؤں سے چل کر لاہور آ گئے اور تلاش روزگار میں مختلف مراحل سے گزر کے اشاعتی کاموں میں مصروف ہو گئے۔

ان کی محنت ذہانت، خلوص اور دیانت داری کے باعث انہوں نے بتدریج ترقی کرنے کی منازل طے کیں۔ اور بالآخر پاکستان کے ممتاز اور نامور اشاعتی اداروں اور ناشران میں شمار کیے جانے لگے۔ مقبول اکیڈمی جو ایک مستند نام ہے۔ جس پر اہل قلم بھی اعتماد کرتے ہیں اور قارئین بھی۔ انہوں نے پاکستان میں اُردو ادب کی آبیاری کی ہے اور آج بھی ایک عمر گزارنے کے بعد اس فرض کی ادائیگی میں مصروف ہیں۔

ملک مقبول احمد صاحب کے ساتھ ایک اور حادثہ، پیش آیا۔ جب چند سال قبل ان کی پوتی نے ان سے فرمائش کی کہ دادا جی آپ سب کی کتابیں چھاپتے ہیں۔ اپنی کتاب

کیوں نہیں چھاپتے کیا آپ کو لکھنا نہیں آتا، معصوم بچی کے اس فقرے نے ایک تازیانے کا کام کیا۔ بچی کے اصرار پر انہوں نے قلم اُٹھایا دیر تک سوچتے رہے کہ کیا لکھوں ۔؟

ستم ظریفی یہ ہے کہ انہوں نے پڑھا تو بہت زیادہ لیکن لکھنے کا تجربہ اور حوصلہ کبھی نہیں کیا۔ سب سے پہلے سوال یہ تھا کہ وہ کیا لکھیں؟ بہت سوچ سوچ کر انہوں نے اپنی خود نوشت یا آپ بیتی لکھنے کا فیصلہ کیا جب لکھنا شروع کیا تو پرانی خوابیدہ یادوں نے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا۔ جوں جوں لکھتے گئے خود اعتمادی پیدا ہوتی گئی اور اُن سب یادوں نے دماغ کا دروازہ کھٹکھٹایا جنہیں وہ لکھتے چلے گئے۔

اس طرح اُردو میں ایک نیا ادیب نمودار ہوا۔ خود نوشت تو لکھ دہی تھی مگر اس کے بارے میں اہل قلم دوستوں سے مشورہ ضروری تھا۔ جس نے بھی ان کی تحریر پڑھی حیران رہ گیا۔ کیونکہ اُس میں سلاست، روانی، بے ساختگی اور سادگی کے ساتھ ان تمام واقعات اور زندگی کے نشیب وفراز کو اُس طرح بیان کیا گیا تھا کہ کتاب اٹھانے کے بعد ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔

کتاب شائع ہو کر سامنے آئی تو قارئین نے بھی ہاتھوں ہاتھ لیا۔ الفاظ کی برجستگی بیان کی بے ساختگی اور برمحل موزوں اشعار کی شمولیت نے پڑھنے والوں کو حیران کر دیا۔ کتاب کا نام ''سفر جاری ہے'' تھا اس کی تعریف وتوصیف نہیں سن کر ملک صاحب کو خود یقین نہیں کہ ۔

''ایسی چنگاری بھی یارب میرے خاکستر میں تھی''

اس دن کے بعد ملک صاحب کو لکھنے کا چسکا سا پڑ گیا ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب اسکے بعد تیسری کتاب ماشاءاللہ اب وہ صحیح معنوں میں اہل قلم حضرات کی صف میں

شامل ہو چکے ہیں۔ نشر و اشاعت کا کاروبار انہوں نے اپنے اہل ذوق صاحبزادوں کے سپرد کر دیا ہے۔ اور خود کو کتابوں کی تصنیف تک محدود کر لیا ہے۔

ان کی ایک کتاب ''اردو کی پچاس نامور شخصیات'' شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے دراصل پچاس ایسی ہستیوں کے خاکے تحریر کیے ہیں۔ جن سے انکا واسطہ پڑا یا پڑتا رہا۔ یہ کتاب دراصل ان کی خاکہ نویسی کا ایک بہت عمدہ نمونہ ہے۔ اپنے کاروبار کے سلسلے میں ان کا ادبی شخصیات سے واسطہ پڑتا رہا ہے۔ جن میں سے بعض سے ان کا قریبی اور قلبی تعلقات قائم ہو گئے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد انہوں نے سوچا تو احساس ہوا کہ بہت سے لکھنے والوں کا تو انہوں نے تذکرہ ہی نہیں کیا۔ اس طرح انہوں نے ایک بار پھر قلم اٹھایا اور پچاس نامور شخصیات کا دوسرا حصہ ''شناسا ادبی چہرے''، قلم بند کر دیا۔

اس کتاب میں بھی ان کی خاکہ نویسی کا وہی انداز ہے جو پہلی کتاب میں تھا۔ ان تمام شخصیات کے نام گنوانا ضروری نہیں ہے۔ انہوں نے ہر ایک کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ جو دیکھا اور محسوس کیا وہی قلم بند کر دیا ہے۔ اندازے بیان سادہ لیکن انتہائی دلکش ہے۔ انہوں نے ان خاکوں میں چلتے چلتے خود اپنے تاثرات کا بھی اظہار کر دیا ہے۔ ملک صاحب ایک وضع دار اور مرنجانِ مرنج انسان ہیں۔ کچھ عرصہ قبل انہوں نے اپنے تمام اہل خاندان کے ساتھ فریضہ حج ادا کیا ہے۔ نیک اور خدا ترس تو وہ پہلے ہی تھے۔ صاحب ریش بھی تھے لیکن حج کے فریضے سے فارغ ہو کر واپس آئے تو دنیاوی مصروفیات اور معمولات کو یکساں ترک کر دیا ہے۔ اب اللہ اللہ کرتے ہیں اور کتابیں لکھتے ہیں۔ ان کا ذہن اور قلم چل نکلا ہے۔ انہوں نے اپنے اندر پوشیدہ صاحب قلم کو دریافت کر لیا ہے۔ اور ایک ناشر بن کر اس غریب سے تقاضہ کرتے رہتے ہیں کہ بھائی کچھ اور لکھو لکھتے رہو کہ جب تک دم میں دم

ہے۔

شناسا ادبی چہرے ایک دلچسپ اور خوبصورت خاکوں پر مشتمل کتاب ہے جس کا مطالعہ نہ صرف آپ کی معلومات میں اضافہ کرے گا۔ بلکہ دلچسپی کا سامان بھی پیدا کرے گا۔

ملک صاحب کی خواہش پر مجھے یہ خوشی اور اعزاز ملا ہے کہ اس کتاب کا حرفِ آغاز لکھنے کا فریضہ انہوں نے میرے سپرد کیا ہے۔ پچھلے دنوں وہ حسب معمول کتابوں اور شیرینی سے لدے پھندے تشریف لائے۔ سوچا کہ اس بہانے ہی سہی ان سے ملاقات تو ہوئی۔ ان کی پسندیدہ کافی لوازمات کے ساتھ انہیں پیش کی گئی۔ لوازمات کو انہوں نے ہاتھ تک نہیں لگایا البتہ کافی سے لطف اندوز ہوئے۔

اب اس امید پر انتظار ہے گا کہ وہ اگلی تصنیف کے ساتھ کب تشریف لائیں گے۔ ''اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ''۔

ان کی صحت مندی اور طویل زندگی کے لیے آپ ابھی دعا کیجئے تا کہ وہ اپنا شوق اور قارئین اسی حوالے سے اپنا ذوق پورا کرسکیں۔

علی سفیان آفاقی

عرضِ سدید

میرے دوست ملک مقبول احمد نے اپنی خودنوشت سوانح عمری ''سفر جاری ہے'' کے نام سے لکھی تو اس کے سادہ اسلوب اور پرخلوص اظہار نے اہل ادب کی توجہ کھینچ لی۔ ایک اچھی کتاب کی طرف قارئین کی رغبت ادب کا معمول کا واقعہ ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس کتاب کی پذیرائی نے ملک مقبول احمد کے باطن سے ایک ایسے تخلیق کار کو ابھار دیا جس کی خوبیاں شاید خود انہیں بھی معلوم نہیں تھیں۔ ملک کے ممتاز ادیب علی سفیان آفاقی نے ان کی کتاب ''پچاس نامور ادبی شخصیات'' کا ''حرف آغاز'' لکھا تو اعتراف کیا:

''ملک مقبول احمد جب سے ادیب کے طور پر سامنے آئے ہیں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے نت نئے انداز اور نمونے سامنے آرہے ہیں''

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ملک صاحب نے پہلے خودنوشت لکھی، پھر سفرنامے کی طرف آگئے اور ''سیاحت نامہ ترکی'' اور حج کا سفرنامہ لکھا' ان کی شخصیت نگاری کا نقش ایک الگ کتاب کی صورت میں سامنے آچکا ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ادیبوں سے سرسری ملاقات نہیں کرتے بلکہ ان کے کردار کے ہر گوشے کو چشم ظاہر سے

دیکھتے ہیں۔ ان کی کتاب پچاس نامور ادبی شخصیات درحقیقت خاکوں کی کتاب ہے جس میں ادیب شناسی کا زاویہ نمایاں نظر آتا ہے۔

اب میں اردو ادب کے ماضی اور حال پر نظر ڈالتا ہوں تو خاکہ نگاری میں ناشرین کے حلقے سے وہ نام نمایاں نظر آتے ہیں۔ ایک شاہد احمد دہلوی جو ''ساقی'' کے مدیر تھے اور ساقی بک ڈپو کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ بھی چلاتے تھے۔ دوسرے محمد طفیل جو پہلے کتابوں کے ناشر بنے اور پھر رسالہ نقوش جاری کیا جس کے خاص نمبر اردو ادب کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ ان دونوں ناشروں نے اپنے ادارے کے ادیبوں کے خاکے بھی لکھے ہیں اور ان کی کتابوں کو اس فن میں مقامِ امتیاز حاصل ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاہد احمد دہلوی اور محمد طفیل نے خاکہ نگاری کی طرف شعوری طور پر قدم بڑھایا تھا اور اپنے قلم کی قوت کو اس طرح استعمال کیا کہ خاکہ نگاری ان کی ادبی شخصیت کی ایک خاص جہت بن گئی۔ دوسری ملک مقبول احمد لاشعوری طور پر شخصیات نگاری کی طرف آتے ہیں۔ ان کی پہلی کتاب ''سفر جاری ہے'' چھپی تو اس میں ایک باب مقبول اکیڈمی کے ادیبوں کے بارے میں بھی تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس باب نے بھی بعد میں انہیں یہ بات سمجھائی کہ ان کی اکیڈمی کو مقام عروج پر پہنچانے میں ادیبوں کا بڑا حصہ ہے اور ان کا فرض ہے کہ وہ انہیں خراج تحسین ادا کریں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب ''پذیرائی'' میں کچھ ادیبوں کا اجمال بھی پیش کر دیا۔ لیکن ان کو احساس ہوا کہ ان کے محسن ادیبوں کا حق ادا نہیں ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اب پوری قامت کے شخصیت نامے لکھے اور پہلی کتاب چھاپ دی تو پھر اس تجربے نے دوسری کتاب کو کروٹ دی۔ اور نتیجہ زیر نظر کتاب ہے۔ جس کا آغاز اردو کی ممتاز شاعرہ ادا جعفری سے ہوتا ہے اور اختتام معروف افسانہ

نگار اور ڈرامہ نویس یونس جاوید پر ہوتا ہے۔ ان دو ناموں کے خطوط وحدانی میں کئی اور نام مثلاً اعزاز احمد آذر، امین راحت چغتائی، بشیر موجد، طالب ہاشمی، عبدالقیوم، شفیع ہمدم ،عمرانہ مشتاق قائم نقوی، غلام نبی اعوان اور متعدد دیگر ادیب موجود ہیں جن کا مطالعہ ملک مقبول احمد نے اپنی داخلی روشنی سے کیا ہے اور اس روشنی کو الفاظ کا جامہ پہنایا تو تو یہ خاکے وجود میں آ گئے جو محترم مصنف کی مردم شناسی اور سیرت نویسی کا نقش پیش کرتے ہیں۔

اس نئی کتاب کے مطالعے کے دوران ایک یہ بات بھی نمایاں نظر آئی کہ اب ملک صاحب اپنی مقبول اکیڈمی کے مصنفین کو ہی اہمیت نہیں دے رہے بلکہ جس کسی سے بھی ان کا ربط و تعلق پیدا ہوئے اسی کے بارے میں اپنی رائے لکھنے سے گریز نہیں کیا۔ بلاشبہ وہ مقبول اکیڈمی پر آنے والے ہر آدمی سے ملتے ہیں لیکن ان کا گوہر شناسی کا جذبہ انہیں انسان '' تلاش کرنے میں مدد دیتا ہے۔ وہ حقیقی انسان کو پا لیتے ہیں تو اس کی شخصیت نگاری کا فریضہ ادا کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

شہرِ بے مثال لاہور میں ہر طرف آدمیوں کا ہجوم ہے۔ ملک مقبول احمد نے اس ہجوم سے چند انسانوں کو تلاش کیا ہے۔ جو خاصۂ خاصان ہیں اور اب ان کی ملاقات اپنے پڑھنے والوں سے کرا رہے ہیں۔ میں اسے ملک مقبول احمد کا الطافِ فراوانی شمار کرتا ہوں اور ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ڈاکٹر انور سدید

لاہور ۷ اپریل ۲۰۱۳

شناسا ادبی چہرے

ادا جعفری

محترمہ ادا جعفری کو جدید اردو شاعری کی خاتون اول شمار کیا جاتا ہے۔ جس طرح عصمت چغتائی نے افسانہ ''لحاف'' لکھ کر اردو افسانے کو نئی کروٹ دی تھی اس طرح ادا جعفری نے جوان دنوں ادا بدایونی کے نام سے معروف تھیں اپنی شاعری کی پہلی کتاب ''اور ساز ڈھونڈتی رہی'' شائع کی تو پیشتر ترقی پسند شعرا بھی حیران رہ گئے کہ یہ شاعرہ کون ہے؟ اور پھر ان کے ادبی تصورات کو خاطر میں لائے بغیر انہیں ترقی پسند شاعرہ کے طور پر قبول کر لیا لیکن ادا بدایونی نے ترقی پسند ادیبوں کی طرح نظریاتی شاعری نہیں کی بلکہ اپنے مشاہدے کو فوقیت دی اور اپنے اندر کی آواز کو سنا اور اسے شاعری میں پیش کر دیا اور پھر عصری شاعری پر اپنے نقوشِ فن مستقل طور پر ثبت کر دیئے۔ اہم بات یہ ہے کہ زمانے کی رفتار کے ساتھ ان کا قدم بھی ہمیشہ ارتقاء کی طرف بڑھتا چلا گیا اور ان کے فن پر کبھی زوال کے آثار نظر نہیں آئے۔

اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ میرا اشاعتی ادارہ مقبول اکیڈمی قائم ہوا تو میں نے اس کے آغاز میں ہی بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی، ان میں سرفہرست رئیس احمد جعفری تھے۔ اب میری لاعلمی دیکھئے کہ میں ادا جعفری کو رئیس احمد جعفری کی عزیزہ سمجھتا رہا۔ ایک دن میرزا ادیب سے ان کا ذکر آیا تو انہوں نے میری غلط فہمی رفع کی اور ان

کی شاعری کا نہ صرف پس منظر بیان کر دیا بلکہ یہ بھی بتایا کہ وہ وفاقی حکومت کے ایک نیک نام سیکرٹری جناب نورالحسن جعفری صاحب کی اہلیہ محترمہ ہیں۔ اب میرے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ ادا جعفری کی کتاب بھی مقبول اکیڈمی سے شائع ہونی چاہئے۔ میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں کراچی جانے لگا تو میرزا ادیب میرے پاس بیٹھے تھے، میں نے ان سے کراچی کے چند نامور ادیبوں کا ذکر کیا تو انہوں نے فوراً ادا جعفری کا نام لیا اور نہ صرف ان کی کتابیں حاصل کرنے کا مشورہ دیا بلکہ مجھے ایک تعارفی خط بھی لکھ کر دے دیا۔

میں یہ خط لے کر ان کے در دولت پر حاضر ہوا تو بڑی خوشی ہوئی کہ انہوں نے میری پذیرائی اسی طرح کی جیسے وہ میرزا ادیب سے مل رہی ہوں۔ کہنے لگیں ''میرزا صاحب سے میرا بے پایاں احترام کا رشتہ ہے''۔ وہ ''ادب لطیف'' کے ایڈیٹر تھے تو میری نظمیں اپنے رسالے میں نمایاں طور پر چھاپتے تھے۔ لمبے عرصے تک انہوں نے اس بات کو صیغۂ راز میں رکھا کہ ادا بدایونی کون ہے؟ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنا حرف مطلب زبان پر لے آیا۔ محترمہ نے بلا توقف مجھے اپنے شعری مجموعے ''شہر درد''، ''غزالاں تم تو واقف ہو''، ''ساز سخن بہانہ ہے'' اور ''ساز ڈھونڈتی رہی'' کے حقوق اشاعت دے دیئے اور پھر خود ہی کہا کہ ''اشاعت کے بعد مجھے ان کتابوں کی صرف پندرہ پندرہ جلدیں بھیج دیں'' میری کتابوں کی یہی رائلٹی ہوگی۔

محترمہ کی اس بات نے میرے دل پر ان کا جو نقش قائم کیا وہ کبھی مٹ نہیں سکا اور مجھ پر بھی ان کا اعتماد ہمیشہ قائم رہا۔

ادا بدایونی کی خودنوشت سوانح عمری ''جو رہی سو بے خبری رہی'' چھپ چکی ہے، اس کتاب کے مطابق وہ 22 اگست 1926ء کو بدایوں کی قلعہ نما حویلی میں پیدا ہوئیں جس کی فضا بڑی پراسرار تھی۔ ان کے والد مولوی بدرالحسن اس شہر کے ایک بڑے زمیندار اور پکے مسلمان تھے لیکن ان کی پرورش ننھیال میں ہوئی۔ ان کے والد کی وفات ہوئی تو ادا جعفری کی عمر صرف تین برس تھی ان کی عبادت گزار والدہ نے ان کی تربیت باپ بن کر کی اور تعلیم کا پورا بندوبست کیا۔ انہوں نے پہلا شعر نو برس کی عمر میں کہا جسے سن

کر ان کی والدہ کی آنکھ میں آنسو آ گئے اور انہوں نے شفقت کی نظر ڈال کر بیٹی کی تعریف کی، اب شاعری ان کی تنہائی کا مداوا بنتی چلی گئی اور فطرت کے حسن کو اپنی نظموں میں ڈھالتی چلی گئیں جو ''ادبِ لطیف''، ''سویرا'' اور ''افکار'' جیسے نامور ادبی رسائل میں شائع ہوتی تھیں۔ نظموں کی اشاعت نے انہیں بڑا حوصلہ دیا اور ان کا تخلیقی سفر کامیابی کی منزلیں طے کرتا چلا گیا۔

جنوری 1947ء میں ان کی شادی آل انڈیا سروس کے ایک افسر نورالحسن جعفری سے ہوگئی جو اس وقت آگرہ میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ آزادی کے بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ کراچی آ گئیں۔ ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ 1950ء میں چھپا۔ عنوان تھا ''میں ساز ڈھونڈتی رہی''۔ اس کا پیش لفظ معروف نقاد ''افسانہ نگار قاضی عبدالغفار نے لکھا تھا اور انہیں مردوں کے معاشرے میں آزادیٔ نسواں کا علمبردار قرار دیا تھا، شاعری کا دوسرا مجموعہ ''شہر درد'' 1967ء میں اور تیسرا مجموعہ ''غزالاں تم تو واقف ہو'' 1972ء میں شائع ہوا۔ ان کی مزید کتابیں ''ساز سخن بہانہ ہے'' اور ''حرف شناسائی'' بعد میں شائع ہوئیں...... ''موسم موسم'' ان کے کلیات کا عنوان ہے۔

خودنوشت ''جو رہی سو بے خبری رہی'' کے علاوہ انہوں نے کلاسیکل شعراء کی غزلوں کا ایک انتخاب ''غزل نما'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے ان کی شخصیت اور فن پر ایک جامع کتاب محترمہ شاہدہ حسن سے لکھوائی اور انہیں پاکستانی ادب کے معماروں میں شمار کیا۔ اس کتاب کا نام ''ادا بدایونی...... شخصیت اور فن'' ہے۔

یہاں ان کی اس انفرادیت کا ذکر بھی ضروری ہے کہ انہوں نے اپنے اولین شعری مجموعے ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' کا پیش لفظ منظوم تحریر کیا تھا اور اس پیش لفظ نے ہی ان کی نظموں کی سمت متعین کر دی تھی اور انہیں انسانیت کی شاعرہ تسلیم کر لیا گیا تھا تاہم غزل سے بھی انہوں نے بے اعتنائی نہیں برتی بلکہ یہ کہنا مناسب ہے کہ انہوں نے اُردو غزل میں نسائی جذبات کا اظہار کیا تو مشرقی قدروں کو بھی قائم رکھا اور شائستگی کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور سچ یہ ہے کہ اپنے احساسات کو جس طرح ادا بدایونی نے کلاسیکی

روپ دیا ہے، اس روپ کو نئی شاعرات نے بگاڑا ہے، سنوارا نہیں۔
ادا بدایونی کا صرف ایک شعر سن لیجئے۔

نازک تھے کہیں رنگ گل و بوئے سمن سے
جذبات کہ آداب کے سانچے میں ڈھلے ہیں

میں اس قسم کے اشعار کو ان کی تہذیبی پاسداری کا نتیجہ قرار دیتا ہوں جو انہیں بچپن کی اعلیٰ تربیت سے حاصل ہوا تھا۔

ادا جعفری کے فکر و فن پر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر اسلم فرخی، میرزا دیب، انور سدید، مشفق خواجہ، جمیل الدین عالی، ڈاکٹر عمران فتح پوری اور متعدد دوسرے نامور ادیبوں نے مضامین لکھے اور ان کے فن کی تحسین کی ہے۔ ان کی کتابوں پر قومی ایوارڈ دیئے گئے اور صدر پاکستان نے انہیں ''تمغۂ حسن کارکردگی'' عطا کیا۔ اکادمی ادبیات نے ان کی خدمت میں کمال فن ایوارڈ پیش کیا۔ بلاشبہ ادا جعفری اردو ادب اور جدید شاعری کی آبرو ہیں اور یہ میری ذاتی خوشی ہے کہ ان کی کتابیں مقبول اکیڈمی سے شائع ہوئی ہیں۔

............☆☆............
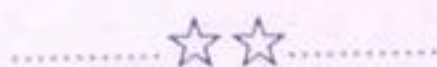
اعزاز احمد آذر

اعزاز احمد آذر کے والد جناب شریف احمد قریشی محکمہ پولیس میں ایک اعلیٰ افسر تھے۔ جن لوگوں کو ان سے ملنے کا اتفاق ہوا وہ سب کہتے ہیں کہ شریف احمد قریشی اسم بامسمی پولیس افسر تھے۔ ''ایک تو اپنے نام کی نسبت سے شریف تھے۔ دوسرے قریشی ہونے کے ناطے وہ اپنے آباء واجداد کی عزت کو بھی قائم رکھتے تھے۔ ان کا وطن مالوف بٹالہ تھا جو ادب کی مردم خیز زمین شمار ہوتی ہے۔ مولانا عبدالحمید سالک، ممتاز مفتی ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، اعجاز حسین بٹالوی کا تعلق بھی اسی سرزمین سے تھا۔ ممتاز مفتی نے ''علی پور کا ایلی'' میں شہر کی تاریخ بیان کی ہے جو علم وادب کی طویل داستان ہے۔ اعزاز احمد آذر اس شہر بٹالہ میں 25 دسمبر 1942ء کو پیدا ہوئے۔ 1947ء میں انہوں نے صرف پانچ سال کی عمر میں بٹالہ سے اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کی اور آگ وخون کا دریا عبور کر کے پاکستان پہنچ گئے۔ ان کے خاندان نے یہاں منٹگمری (حال ساہی وال) کو اپنی مستقل بودوباش کے لیے منتخب کیا۔ اعزاز احمد آذر ادب کا شوق بٹالہ سے ہی لے کر آئے تھے لیکن اس بوٹی نے ان کے اندر زیادہ مشک ساہی وال میں آ کر مچایا اور بچپن میں ہی شعر موزوں کرنے شروع کر دیئے۔ اور میٹرک پاس کرنے تک ادب کا یہ بوٹا قد آور درخت بن چکا تھا۔ مزید تعلیم کے لیے انہوں نے ایم پی ای ہائی سکول شاہدرہ میں داخلہ

لیا۔ اعزاز احمد کو کرکٹ سے بھی شوق تھا۔ اس زمانے میں کرکٹ کی دنیا میں جناب دلاور حسین کا ڈنکا بج رہا تھا۔ انہوں نے اعزاز احمد کو ایم اے او کالج میں داخل کیا جس کے وہ خود پرنسپل تھے اور پھر تعلیم کے ساتھ ان کی کرکٹ پر بھی توجہ دینی شروع کر دی اور انہیں کالج کا آل راؤنڈر بنا دیا جو جہاں جاتے ایم او کالج کے لیے ٹرافیاں جیت کر لے آتے۔ تعلیمی زاویے سے وہ اس کالج کے تین اساتذہ کی تربیت کا اعتراف کرتے ہیں۔

اوّل: ڈاکٹر برہان احمد فاروقی

دوم: پروفیسر اسمٰعیل بھٹی

سوم: پروفیسر افتخار احمد

ان سب کے مضامین الگ الگ تھے۔ لیکن قدرِ مشترک ادب تھی۔ اور ان سب نے اعزاز احمد کے باطن شاعر آذر کو سطح پر رونما ہونے میں بڑی مدد دی انہیں کالج میگزین ''میزاق'' کا ایڈیٹر بنایا اور یونیورسٹی مشاعروں میں ایم اے او کالج کا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ اعزاز احمد نے اس دور میں اپنے کالج کے لیے سب سے زیادہ ٹرافیاں جیتیں اور ان کا نام پورے پنجاب میں مشہور ہو گیا۔ ان کا یہ شعرہ بہت مشہور ہوا۔

جس نے مجھے اعزاز سے آذر ہے بنایا
پوچھو تو خدا ہاتھ لگایا تو صنم ہے۔

اعزاز احمد آذر نے 1965ء کی جنگ میں قومی خدمات میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ وہ اپنے علاقے میں شہری دفاع تنظیم کے چیف وارڈن مقرر کیے گئے اور وہ اپنی ٹیم کو لے کر ساری رات علاقے کی پہرے داری کرتے۔ اس دور میں ہی آذر اپنی شہرہ آفاق پنجابی نظم ''شہید دی بہن'' لکھی جس کی خوشبو اس دور کے صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان تک پہنچی تو انہوں نے اپنے وزیر داخلہ کو محمود ہارون کے وسیلے سے گولڈن میڈل پیش کیا۔ یہ تقریب شاہدرہ میں منعقد ہوئی اور وزیر داخلہ محمود ہارون نے صدر پاکستان کا تمغہ اعزاز احمد آذر کے گلے میں سجایا۔ اعزاز احمد آذر نے ایم اے کرنے

کے ساتھ ساتھ ایل ایل بی کا امتحان بھی پاس کیا اور پنجابی زبان کو یونیورسٹی میں ایم اے کی سطح پر جاری کرنے کی تحریک شروع کردی۔ آذر صاحب کے اس کام میں مشتاق بٹ ان کے معاون تھے۔ خدا نے انہیں کامیابی دی اور ایم اے کے درجے پر یونیورسٹی نے کلاسیں شروع کردیں۔ اب اردو کے ساتھ پنجابی بھی آذر صاحب کے اظہار کا ذریعہ بن گئی اور انھوں نے ریڈیو پاکستان لاہور سے کئی نئے پنجابی پروگرام شروع کیے جواب بھی جاری ہیں۔

اعزاز احمد آذر نے اپنی عملی زندگی کا آغاز 1974 میں ڈائریکٹر نیشنل سنٹر کی حیثیت میں سیالکوٹ سے شروع کیا۔ اس کے بعد اس عہدے کو انھوں نے ملتان، گوجرانوالہ، بہاول پور، اسلام آباد اور لاہور میں اپنی محنت سے چمکایا اور اس کا اعتراف سب حلقوں نے کیا۔

اعزاز احمد آذر اردو اور پنجابی کے نامور شاعر ہیں۔ ''دھیان کی سیڑھیاں ''محبت مشغلہ تھی''، دھوپ کا رنگ گلابی ہو''، ان کی شاعری کے مجموعے ہیں۔ پنجابی میں ان کی کتابیں ''موسم سی برساتاں دا''، ''اساں کیتیاں یار کمایاں'' اور ''نویکلا'' وغیرہ چھپ چکی ہیں۔ ان کے کالموں کا مجموعہ ''دھیان نگر'' کے نام سے شہرت پا چکا ہے۔ وہ اس وقت ادبی دنیا اور ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے مقبول ترین ادیب ہیں اور عالمی مشاعروں میں بلائے جاتے ہیں۔

خوش لباس خوش کلام، خوش گفتار اور خوش اطوار اعزاز احمد آذر میرے بہترین دوستوں میں سے ہیں۔ ان کی ادبی سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے اور وہ دائرے کو اپنی ذات کے لمس سے منور کر رہے ہیں۔ خدا ان کی عمر دراز کرے۔ اور ٹی وی پر ان کی آواز ابھرتی اور تصویر جگمگاتی رہے کیوں کہ یہ ایک صحت مند محبِ وطن پاکستانی کی آواز ہے۔

☆☆
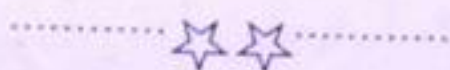
افتخار مجاز

آپ سن کر حیران ہوں گے کہ افتخار مجاز کو جب تک قریب سے ملنے اور ان سے بات چیت کرنے کا موقع نہیں ملا تھا تو میں انہیں سرور مجاز مرحوم کا صاحبزادہ سمجھتا رہا۔ ایک دن اردو کے معروف شاعر اعزاز احمد آذر مقبول اکیڈمی پر تشریف لائے تو کہنے لگے کہ افتخار مجاز کو اپنی اکیڈمی کی کتابیں بھجوائیں، ان دنوں وہ ٹی وی پر کتابوں کی رونمائی کر رہے ہیں۔ میں ان کا نام سن کر یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

وہی ''افتخار مجاز جو سرور مجاز مرحوم کے بیٹے ہیں''۔

میری بات سن کر اعزاز احمد آذر ہنس ہنس کر دوہرے ہو گئے۔ جب ہنسی رکی تو بولے۔

''افتخار مجاز میرا چھوٹا بھائی ہے''۔

میں نے اپنی شرمندگی کا اظہار کیا تو بولے۔ ''آپ ہی نہیں۔ اکثر لوگ یہی سمجھتے ہیں۔''

لیکن اسی شام پی ٹی وی سے ایک ٹیلی فون آ گیا۔ دوسری طرف سے کوئی صاحب مہذب انداز میں کہہ رہے تھے۔

''میں نے ملک مقبول احمد سے ملنا ہے؟''

میں نے جواب دیا۔

''میں مقبول احمد ہی بول رہا ہوں''

دوسری طرف سے آواز آئی ''میں افتخار مجاز ہوں۔ اعزاز احمد آذر صاحب کا چھوٹا بھائی''۔ میں نے صبح کے واقعہ کا ذکر کیا تو سن کر ہنسنے لگے۔ اور پھر بولے ''کئی لوگ تو پوچھتے ہیں کہ میرا اسرار الحق مجاز سے کیا رشتہ ہے؟ اور میں انہیں ٹال دیتا ہوں۔''

اس کے بعد ان سے ملاقات ہونے لگی۔ اور میں اپنے ادارے کی کتابیں انہیں پی ٹی وی پر تبصرے کے لئے بھیجنے لگا۔ ان کی بڑی خوبی یہ دیکھی کہ جب تبصرہ ریکارڈ ہو جاتا اور اس کے نشر ہونے کی تاریخ بھی مقرر ہو جاتی تو افتخار مجاز مجھے اس کی اطلاع کر دیتے کہ فلاں دن تبصرہ ٹی وی پر دیکھیں۔ اب مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ افتخار مجاز نے ملک میں ''کتاب کلچر'' کو فروغ دینے میں اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ''انٹرنیٹ'' اور ''ویب سائیٹ'' کے فروغ سے کتابوں کی طرف لوگوں کی رغبت کم ہو گئی ہے۔ لیکن افتخار مجاز اس خیال کو قبول نہیں کرتے اور کہتے ہیں۔ میڈیا پر کی ہوئی باتیں ہوا میں اڑ جاتی ہیں۔ انٹرنیٹ اور ویب سائیٹ کی وجہ سے دنیا کی تمام اہم لائبریریاں ہمارے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی ہیں۔ لیکن ''پرنٹ میڈیا'' اور کتاب کی مقبولیت پر اثر نہیں پڑا۔ اور نہ پڑے گا۔ ثبوت کے طور پر بتاتے کہ جن کتابوں پر وہ تبصرے نشر کرتے ہیں ان کے بارے میں ناظرین کے سوالات اور خطوط کثرت سے آنے لگتے ہیں۔ اور بہت سے ناشرین نے بھی تسلیم کیا ہے کہ ٹی وی کے تبصرے کے بعد کتاب کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔

ان کا اصلی نام افتخار احمد ہے۔ شاعری کے میدان میں آئے تو اپنا تخلص مجاز اختیار کیا۔ تاریخ پیدائش 15 دسمبر 1953 ہے۔ گویا فاروق آباد ضلع شیخوپورہ میں پیدا ہونے والا یہ بندۂ مجاز جو در اصل بندۂ حقیقت ہے اپنی زندگی کی 59 بہاریں دیکھ چکا ہیں۔ جو بہن بھائیوں میں اس کا آخری نمبر تھا۔ اس لیے سب کا لاڈلا بن گیا۔ ایم اے او کالج میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا۔ لیکن امتحان آرٹس کا دیا۔ ان کی ادبی تربیت عارف عبدالمتین پروفیسر نصیر شادانی اور ارشد کیانی نے کی۔ وہ ان کے علاوہ امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی کی شاگردی کا بھی

اعتراف کرتے ہیں جو ان دنوں ایم اے او کالج میں استاد تھے۔ بی اے اسلامیہ کالج سول لائنز سے کیا جہاں ڈاکٹر اعزاز نقوی، یوسف جمال انصاری اور دلدار پرویز بھٹی ان کے اُستاد تھے۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، وارث میر اور مسکین حجازی سے ایم اے میں صحافت و ابلاغ کی تعلیم حاصل کی۔ لیکن انہوں نے ایک ایم اے پر اکتفا نہیں کیا۔ بعد میں سیاسیات اور اردو میں بھی ایم اے کر لیے۔ گویا افتخار مجاز ''ٹرپل ایم اے'' ہیں۔ عملی زندگی واپڈا میں افسر تعلقات عامہ کی حیثیت سے شروع کی لیکن پی ٹی وی میں آ گئے اور ترقی کی منزلیں طے کرنے لگے اور کنٹرولر کرنٹ افیئر کے عہدے پر پہنچ گئے۔ شعر و ادب سے ان کا تعلق دیرینہ اور مستقل ہے۔

ذاتی زندگی میں افتخار مجاز مشرق کی اخلاقیات اور دینی قدروں پر عمل کرنے اور انہیں فروغ دینے والے انسان ہیں۔ وہ ادبی معاشرے میں بے راہ روی دیکھتے ہیں تو کڑھتے ہیں اور بزرگ ادیبوں کو متوجہ کرتے ہیں کہ اس ادبی بے راہ روی کا تدارک کریں۔ مجھے بتانے لگے کہ انہیں بڑے واہیات قسم کے گمنام خطوط ملتے ہیں جن کا مقصد صرف گندگی پھیلانا ہوتا ہے اور مجھے شاید اس لئے بھیجے جاتے ہیں کہ میں ان خطوط میں متذکرہ ادیبوں کے بارے میں اپنی رائے بدل لوں...... اور یہ رائے کسی طرح ٹی وی پر بھی نشر ہو جائے۔ لیکن افتخار مجاز اس معاملے میں بہت محتاط ہیں۔ گمنام خط پڑھتے ضرور ہیں لیکن اس کا اثر نہیں لیتے اور اسے پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے ہیں۔

ادبی معاشرے میں یہ تاثر پھیلا ہوا ہے کہ میڈیا ایکٹروں اور موسیقاروں کو ٹی وی پر بہت اہمیت دیتا ہے لیکن بڑے بڑے ادیبوں کے ساتھ بھی میڈیا سوتیلی ماں کا سلوک کرتا ہے۔ اس ضمن میں افتخار مجاز کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ٹی وی پر کئی پروگرام ادیبوں پر کرائے اور ان کے فن کی تحسین کی۔ کتابوں کے تبصروں کو بھی ''ڈاکیومنٹری'' کی صورت دی۔ مصنف کی تصویر کے ساتھ متن کی نمائش اور بعض مناظر کی ڈرامائی تشکیل بھی کی گئی۔ کسی ادیب کی وفات کی خبر ملتی اسے پورے ملک میں بار بار نشر کرواتے اور ٹی وی ٹیم کو آخری

رسومات کی ''کوریج'' کے لئے بھیجتے۔ افتخار مجاز کی ان خدمات کا اعتراف ضروری ہے۔ اور میں ان کی کشادہ دلی، کشادہ نظری کو تسلیم کرتا ہوں۔ اللہ انہیں صحت مند زندگی دے اور ان کی خدمات کا یہ سلسلہ جاری رہے۔ آمین!

☆☆
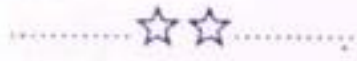
ڈاکٹر امجد پرویز

ڈاکٹر امجد پرویز انسانوں اور کتابوں سے محبت کرنے والے پاکستان کے ایک ممتاز ادیب ہیں۔ وہ انسانوں کی روح کو اپنی دلفریب موسیقی سے سرشار کرتے ہیں اور کتاب سے محبت کا ثبوت اپنے تبصروں میں کرتے ہیں، جو مصنفین کو مزید اچھا ادب پیدا کرنے کی ترغیب دیتے اور انہیں قلمی طور پر متحرک رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر امجد پرویز 28 مارچ 1964ء کو لاہور کے ایک علمی اور ادبی خاندان میں پیدا ہوئے۔ اس خاندان کے ایک فرد جلیل خواجہ دل محمد تھے جو ریاضی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انہوں نے انجمن حمایت اسلام اور اسلامیہ کالج لاہور کے وسیلے سے مسلمان طلباء میں علم کی روشنی پھیلائی۔ انہیں ریاضی جیسے خشک مضمون میں دلچسپی لینے اور تحریک پاکستان میں خصوصی خدمات انجام دینے کا سبق دیا۔ خواجہ دل محمد کے تمام اوصاف حسنہ ڈاکٹر امجد پرویز کو وراثت میں ملے ہیں۔ ان کی ریاضی دانی ہی انہیں انجینئرنگ کے شعبے کی طرف لے گئی۔ انہوں نے انگلستان سے میکینکل انجینئرنگ میں ماسٹرز اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور پاکستان واپس آکر انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں نو سال تک نوجوان طلباء کو انجینئرنگ کی تعلیم دی۔ انجینئرنگ کے ایک معیاری مشاورتی ادارے ''نیس پاک'' نے ان کی خدمات حاصل کر کے انہیں وائس پریذیڈنٹ کا عہدہ پیش کیا اور

وہ اسی ادارے سے پریذیڈنٹ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

ڈاکٹر امجد پرویز کی شخصیت کا ایک اور روشن زاویہ ان کی موسیقی سے غیر معمولی رغبت ہے۔ جواب عشق کا درجہ اختیار کر چکا ہے۔ وہ 1954ء میں ریڈیو پاکستان سے بچوں کے پروگرام میں گلوکار کی حیثیت میں متعارف ہوئے اور پھر یہ رستہ وسعت پذیر ہوتا گیا۔ ٹیلی ویژن اور تھیٹر نے ان کی موسیقی کے فنی ریاض کو پروان چڑھایا۔ انہوں نے نہ صرف پرانی دھنوں میں نغمے، گیت، غزلیں اور نظمیں پیش کیں بلکہ کلاسیکی موسیقی میں ''خیال'' کی صنف میں کئی راگ پیش کر کے اہل فن سے داد و تحسین حاصل کی۔ حتیٰ کہ ان گائیکوں نے بھی جن کا تعلق موسیقی کے خاص خاص گھرانوں سے ہے ان کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے دیکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر امجد پرویز کا مزاج تقلیدی نہیں، تخلیقی ہے۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے مغربی سازوں پر مشرقی دھنوں کو اس خوبصورت امتزاج سے پیش کیا کہ ان کے رنگ اور آہنگ میں نئی نغمگی پیدا ہوگئی۔ ان کے موسیقی کے اساتذہ میں استاد نزاکت علی خان، سلامت علی خان اور موسیقار شہریار شامل تھے اور ان کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے پیشہ ور موسیقاروں کے ساتھ شوقیہ فنکاروں کو باہم منسلک کرنے میں اعلیٰ خدمات انجام دیں۔ اپنی اس حیثیت میں انہوں نے دنیا کے بہت سے ممالک کا سفر کیا اور اپنا فن پیش کر کے خراج تحسین حاصل کیا ہے، چنانچہ انہیں اب پاکستان کا ''ثقافتی سفیر'' کہا جاتا ہے، اور بیرونی ممالک میں جب پاکستانی سفارت خانے ''ثقافتی تقریبات'' منعقد کرتے ہیں تو انہیں خصوصی طور پر مدعو کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر امجد پرویز نے ثابت کیا ہے کہ موسیقی جیسا فن کسی ایک گھرانے کی میراث نہیں بلکہ سُر اللہ کی عطا ہے، جو اپنے پسندیدہ بندوں کے گلے میں پیدا کر دیتا ہے، اور وہ سکہ بند ثقافتی گھرانوں کے موسیقاروں کو بھی مات کر جاتا ہے۔ صدرِ پاکستان نے ان کو ثقافتی حدمات پر تمغۂ حسن کارکردگی سے نوازا ہے۔

ڈاکٹر امجد پرویز اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور رکھتے ہیں اور کسی

کتاب کو پورا پڑھے بغیر تبصرہ نہیں کرتے۔ ان کے تبصروں میں سخن شناسی کا مثبت زاویہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنے والے اپنی تصنیف پر ان کے تبصروں کے منتظر رہتے ہیں۔ ان کے انگریزی تبصروں کا ایک ضخیم انتخاب کتاب کی صورت میں بھی چھپ چکا ہے، کئی خریدار میرے ادارے کے شوروم پر آتے ہیں تو وہ مجھے بتاتے ہیں کہ وہ ڈاکٹر امجد پرویز کا تبصرہ پڑھنے کے بعد کتاب خریدنے کے لیے آئے ہیں۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر صاحب فروغ کتب میں بھی اہم خدمت انجام دے رہے ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے اردو کی کتابوں کو انگریزی دان طبقے سے متعارف کرایا ہے۔

ڈاکٹر امجد پرویز کو اللہ تعالیٰ نے شرافت اور نجابت کے زریں اوصاف سے نوازا ہے۔ ان سے ملاقات ہو تو احساس ہوتا ہے کہ آپ ایک تہذیب یافتہ شخص سے مل رہے ہیں جو ملاقاتی کی عظمت کو پہچانتا ہے، ان کے چہرے پر ہمیشہ ایک جاوداں مسکراہٹ آویزاں رہتی ہے، وہ اپنی بات ہمیشہ عجز وانکساری سے پیش کرتے ہیں، اور مخاطب کا دل موہ لیتے ہیں۔ وہ پیشہ ور انجینئر ہیں، ان کے کارنامے تعمیری نوعیت کے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ موسیقی اور ادب نے ان کو دوام ابد سے سرفراز کر دیا ہے۔ بلاشبہ ڈاکٹر امجد پرویز ہر انسان کے دل میں ہمیشہ آباد رہنے والی شخصیت ہیں۔ ڈاکٹر امجد پرویز نے میری خودنوشت ''سفر جاری ہے'' پر ''دی نیشن'' لاہور میں خیال افروز تبصرہ تفصیل سے لکھا تھا۔

☆☆
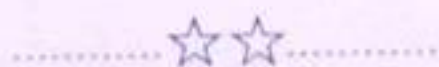
ڈاکٹر اللہ بخش ملک

ڈاکٹر اللہ بخش ملک کا تعلق اگرچہ سول سروس آف پاکستان سے ہے۔ لیکن ان کے باطن میں ایک محبِ وطن پاکستان پرورش پا رہا ہے، جو وطنِ عزیز کو ترقی کے ہفت آسمان پر پہنچانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اور اس کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے دو طریقے اختیار کئے ہیں۔ اول اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور حکومت پاکستان میں ایک بلند مقام عہدے پر فائز ہونے کے بعد اپنی زندگی خدمت پاکستان اور فلاح پاکستان کے لیے وقف کر دی۔ دوم تصنیف و تالیف کا شغل اختیار کیا۔ کتابوں کو اپنا دوست بنایا۔ سرکاری امور انجام دینے کے بعد ان کی فرصت کا تمام وقت دنیا کے عظیم مصنفین کے ساتھ گزارنا۔ وہ ان کے خیالات کو حرزِ جان بناتے اور ذاتی تجزیے سے ایسے نتائج اخذ کرتے جن پر ایک نئی کتاب لکھی جا سکتی تھی۔ ان کا نظریہ ہے کہ جب تک پاکستان تعلیم میں ترقی کی منزلیں طے نہیں کرتا اور ناخواندگی کا قلع قمع نہیں کیا جاتا ملک سے جہالت کے اندھیرے دور نہیں کئے جا سکتے خوشحال اور خردمند پاکستان کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ انہوں نے تعلیم کے موضوع کو بنیادی اہمیت دی اور پندرہ سے زائد تحقیقی کتابیں لکھیں۔ ان کی کتابیں یونیورسٹی کے اعلیٰ درجوں میں وہ طلباء پڑھتے ہیں جو ملک میں تعلیم کی ترقی میں دلچسپی رکھتے ہیں اور علوم جدیدہ سے واقفیت

کو ضروری خیال کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اللہ بخش ملک کا تعلق قطب شاہی اعوان قبیلے سے ہے۔آپ 16 جون 1960ء کو چکوال میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد محترم حاجی غلام حسین اعوان کا شمار اس علاقے کے نامور لوگوں میں ہوتا ہے۔انہوں نے نہ صرف اپنے بچوں کی تعلیم میں دلچسپی لی بلکہ چکوال جیسے دور افتادہ پسماندہ علاقے میں علم کی روشنی پھیلانے میں بھی بے پناہ خدمات انجام دیں۔علاقے کو ترقی یافتہ بنانے کے لیے فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنے بچوں کی روشن خیالی کے ماحول میں پرورش و پرداخت کی۔اس کی مثال ان کے صاحبزادے اللہ بخش ملک صاحب ہیں جنہوں نے ابتدائی تعلیم چکوال کے عام مدرسوں سے حاصل کی۔ایم اے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے کیا اور مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ چلے گئے۔انہوں نے 2002ء میں کیمبرج یونیورسٹی لندن سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی لیکن اس سے قبل وہ اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلے کے امتحان پاس کر کے سول سروس آف پاکستان میں شمولیت اختیار کر چکے تھے۔اس دوران انہیں امریکہ، برطانیہ، فرانس، سعودی عرب، جنوبی افریقہ، بنگلہ دیش اور متحدہ امارات کی سیاحت کا موقع بھی ملا۔ان ممالک میں انہوں نے یہ حقیقت جاننے کی کوشش کی کہ ان ممالک کی ترقی کا راز کیا ہے اور ہمارا ملک جو قدرتی وسائل سے مالا مال ہے اور افرادی قوت اور ذہانت سے بھی سرفراز ہے پسماندہ کیوں رہ گیا ہے۔اس مطالعے نے ان کو تجزیہ و تحقیق کی ڈگر پر ڈالا۔چنانچہ انہوں نے کیمبرج سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی تو انہیں اکانومسٹ، ماہر تعلیم اور سوشل سائینٹسٹ ہونے کا اعزاز خاص عطا کیا گیا۔اس تجربے کو انہوں نے اپنے وطن میں مختلف مدارج استعمال کرنے کی کاوش کی اور ان کی خدمات کو معاشرتی سطح پر اتنا سراہا گیا کہ ان کی خدمت میں ''ستارہ سماج'' کا اعزازی تمغہ پیش کر دیا گیا۔اور انہیں پاکستان سوسائٹی آف ڈیویلپمنٹ اکنامکس کا رکن منتخب کیا گیا۔

ڈاکٹر اللہ بخش ملک اپنی ابتدائی زندگی میں اپنے والد محترم کے فلاحی کاموں سے متاثر تھے۔وہ دیکھتے کہ چکوال کے خورد و کلاں ان کے پاس اپنی اغراض و مقاصد لے کر

آتے اور وہ انہیں ہمیشہ قابلِ عمل نیک مشورے دیتے اور انہیں معاشرے کے قومی فریضے کے طور پر ادا کرنے کا درس دیتے۔ جناب غلام حسین اعوان کا طریق بڑا سادہ تھا وہ اپنے ملنے والوں کو ہمیشہ اپنے عمل سے متاثر کرتے اور اچھے کام کی تبلیغ کرنے کی بجائے خود ان سے دریافت کرتے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو کس طرح معاشرے کی بہبود اور ذاتی ترقی کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر اللہ بخش ملک دیکھتے کہ ان کے والد محترم دانش کی تمام روشنی قران کریم سے حاصل کرتے تھے۔ شعائر اسلام پر سختی سے عمل کرتے اور دوسروں کو اس کی ترغیب دیتے ان کے والد کی پاکیزہ زندگی نے انہیں بہت متاثر کیا اور وہ بھی اسلامی کتب بالخصوص سیرت نبوی ﷺ کے گہرے مطالعے کی طرف راغب ہو گئے۔ ان کا مزاج مذہبی ہے لیکن وہ تنگ نظر نہیں ہیں۔ کیوں کہ انہوں نے حضور نبی اکرم محمد مصطفےٰ ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے اپنی زندگی کے دھارے کو صراط مستقیم پر ڈالا ہے۔ ملک صاحب کے کتب خانے میں سیرت کی کتابوں کا اعلیٰ ذخیرہ موجود ہے اور وہ ان کے مطالعہ سے روزانہ فیضیاب ہوتے اور دیدہ دل کو منور کرتے ہیں۔ ایک دن مجھے بتانے لگے کہ مجھے جب زندگی میں کوئی مشکل مرحلہ پیش آجاتا ہے تو میں پیغمبر کائنات ﷺ کی زندگی کی طرف رجوع کرتا ہوں اور سیرت کے مطالعے کے دوران ہی مجھے مشکل کا حل مل جاتا ہے۔

ڈاکٹر اللہ بخش ملک حکومت پاکستان کے ایک کامیاب افسر ہیں۔ لیکن ان میں افسرانہ شان کسی نے نہیں دیکھی ان کا دل ایک درویش، سخی مزاج انسان کا دل ہے۔ اسلام کے راستہ کو ہی اس دنیا کی فلاح کا راستہ سمجھتے ہیں اور اس پر نہ صرف خود عمل کرتے ہیں بلکہ اپنے عمل سے دوسروں کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کی چند کتابیں اپنے ادارہ سے شائع کیں۔ اس کے بعد ان کے ساتھ ایک روحانی تعلق قائم ہو گیا جو ہر روز روبہ ترقی ہے۔ بلاشبہ ڈاکٹر اللہ بخش ملک جیسے انسان دوست افسروں نے ہی پاکستان کی ساکھ کو بحال رکھا ہوا ہے اور اپنی دیانت اور محنت سے اس ملک کی ترقی میں کوشاں ہیں۔ تعلیمی میدان میں پیشہ ورانہ خدمات اور جدید طریقہ تعلیم متعارف کرانے پر اقوامِ متحدہ یونیسکو نے ڈاکٹر اللہ بخش ملک کو کنفیوشس ایوارڈ سے نوازا ہے۔ یہ ایوارڈ انہیں

ستمبر 2011ء کو ایک بین الاقوامی کانفرنس میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے عطا کیا۔ آپ یہ ایوارڈ حاصل کرنے والے پہلے پاکستانی اور مسلمان ہیں۔ حکومتِ چین نے بھی یہ ایوارڈ ملنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کو چین کا اعلیٰ سول ایوارڈ دیا ہے اور حکومت برطانیہ برٹش کونسل نے آپ کو پاکستان کے لیے The British Alumni Ambassader مقرر کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس بات پر مصر ہیں کہ۔

کبھی کچھ کام بھی آؤ وگرنہ نام کا کیا ہے
تمہارا بھی نہیں رہنا ہمارا بھی نہیں رہنا

☆☆
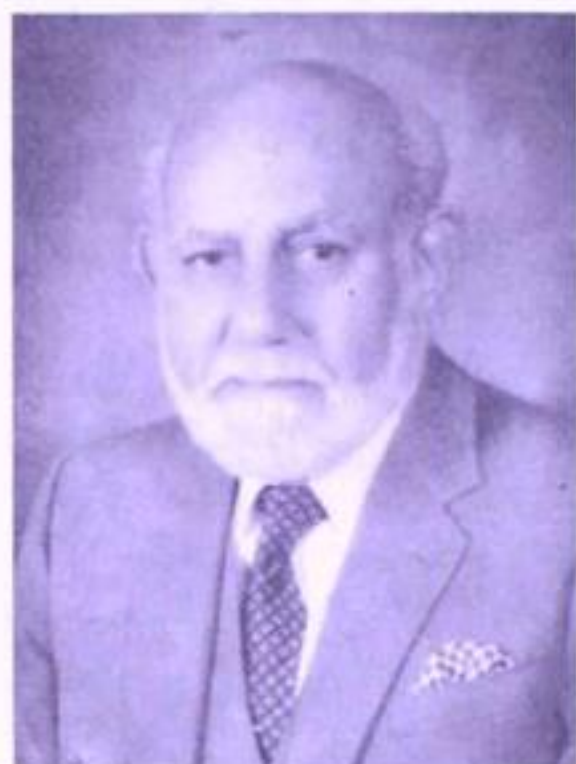
امین راحت چغتائی

امین راحت چغتائی اپنی عمر کی اکاسی بہاریں گزار چکے ہیں لیکن انہیں دیکھیں تو خوبصورت ترشی ہوئی داڑھی کے ساتھ ابھی جوان نظر آتے ہیں لیکن ان کا چہرہ بتاتا ہے کہ انہوں نے زندگی کو محض گزارا ہی نہیں بلکہ اس کے تجربات بھی سمیٹے ہیں اور اب ان تجربات کو ہی شاعری اور مضامین کے ذریعے دنیا کو لوٹا رہے ہیں۔

امین راحت چغتائی 15 اکتوبر 1930ء کو رنگون (برما) میں پیدا ہوئے انہوں نے دین کے گھوارے میں تربیت پائی لیکن اپنی آزاد خیالی کو بھی قائم رکھا اور عملی زندگی کا آغاز ریڈیو راولپنڈی کی صداکاری سے کیا۔ اس دوران امین راحت چغتائی کے باطن سے ایک شاعر بیدار ہو گیا جو موسیقی کا رسیا تھا۔ انہیں ترقی پسند ادب کی تحریک نے اپنی طرف متوجہ کیا اور انہوں نے مزدوروں، محنت کشوں اور ناداروں کے لیے بے شمار نظمیں لکھیں ۔ موسیقی کے شوق نے انہیں استاد موسیقاروں کے ریکارڈ جمع کرنے کی طرف راغب کیا۔ میرے دوست جمیل آذر مجھے بتا رہے تھے کہ ان کے پاس کانن دیوی، سہگل، اختری بائی، بڑے غلام علی خاں، پنکج ملک، ثریا اور خورشید کے بھونپو پر بجنے والے گراموفون ریکارڈ موجود ہیں اور جب کبھی انہیں تنہائی ستاتی ہے تو وہ اپنے ڈرائنگ روم کے دروازے بند کر کے موسیقی سننے لگتے ہیں ۔ ریڈیو راولپنڈی میں انہوں نے ڈرامہ

نگاری اور فیچر نگاری میں بھی سکہ جمایا۔ اسلام آباد میں پی ٹی وی شروع ہوا تو امین راحت چغتائی دینی، اصلاحی اور قومی پروگرام نشر کرنے لگے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا وہ اپنا سکرپٹ جلی قلم سے لکھوا کر سامنے رکھتے تھے لیکن ان کے ایک دوست راوی ہیں کہ امین راحت چغتائی اپنے موضوع کا پورا مطالعہ کر کے پروگرام تیار کرتے اور ٹی وی پر فی البدیہ تقریر کرتے جن لوگوں نے ان کی ترقی پسند ادیبوں سے وابستگی کا دور دیکھا وہ انہیں ٹی وی پر مذہبی اور دینی تقریریں کرتے ہوئے دیکھتے تو حیران ہوتے۔ ان کا یہ پروگرام نصف صدی سے زیادہ عرصے تک ٹی وی پر جاری رہا اور اتنا مقبول ہوا کہ وہ ایک حلقے میں ''پیر جی'' مشہور ہو گئے کئی لوگوں نے ان کے دست حق پرست پر بیعت کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

امین راحت چغتائی نے ایم اے تک تعلیم مکمل کرنے کے بعد کچھ عرصہ روزنامہ صحافت میں بھی گزارا۔ اس تجربے کی اساس پر ہی سفارت خانہ جاپان نے انہیں پریس ایڈوائزر مقرر کر دیا جہاں انہوں نے اپنی خدمات بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیں۔ کہتے ہیں کہ جاپانی سفارت خانے کی ملازمت نے ان کے مزاج پر بڑے مثبت اثرات مرتب کئے اور جاپانیوں کے جھک جھک کر سلام کرنے کے انداز نے ان میں انکساری کا جذبہ پیدا کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں اپنی انا کو صحت مند انداز میں تحفظ عطا کرنے کا سلیقہ حاصل ہو گیا اور انہیں کبھی مجروح انا کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

میں نے امین راحت چغتائی کو سب سے پہلے پاک ٹی وی پر دیکھا اور حیران بھی ہوا کہ ایک داڑھی سے صاف نوجوان قرآن کی آیات کی تفسیر کر رہا تھا، احادیث پاک سنا رہا تھا اور تاریخ اسلام کے واقعات بیان کر کے بھٹکی ہوئی انسانیت کو راہ راست پر لا رہا تھا پھر دیکھا تو ان کے چہرہ مبارک پر سفید داڑھی لہرا رہی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے امین راحت چغتائی کے دونوں چہرے اچھے لگے کیوں کہ یہ دونوں چہرے ان کے باطن کی پاکیزگی کے مظہر تھے اور اس قول کی صداقت پیش کرتے تھے کہ ''چہرہ دل کا آئینہ ہوتا ہے'' امین راحت چغتائی بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ مطالعہ اقبال نے ان کی شاعری پر

اثر ڈالا ہے لیکن انہوں نے اقبال کی علامتوں سے اپنی نئی علامتیں وضع کیں۔ان کی شاعری کا مجموعہ ''بھید بھنور'' کے نام سے چھپ چکا ہے اس کی فنی اور معنوی خوبیوں کا تذکرہ بیشتر نقادوں نے کیا ہے اور یہ اتنی اہم کتاب ہے کہ میں نے کہیں اس کے خلاف ایک تبصرہ بھی نہیں پڑھا اور خوبی یہ ہے کہ اس کتاب کو دنیا کے مشہور مصور عبدالرحمٰن چغتائی نے اپنی تصویروں سے سجایا ہے جو امین راحت صاحب کے اشعار کی تعبیریں سامنے لاتی ہیں ''بام اندیشہ'' میں ان کی غزلیں اور ''ذرا بارش کو تھمنے دو'' ان کی نظموں کے مجموعے ہیں۔اب مجھے یاد آرہا ہے کہ شاہد شیدائی نے رسالہ ''کاغذی پیرہن'' میں جدید اردو نظم کے منفرد شاعروں کو متعارف کرانے کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا تھا جس میں میرا جی، ن م راشد اور مجید امجد جیسے شاعر زیر بحث لائے جارہے تھے۔شاہد شیدائی نے اس سلسلہ میں امین راحت چغتائی کی نظموں کا انتخاب پیش کیا اور ان کی فنی خوبیوں کو ایک خیال انگیز مقالے میں پیش کیا۔امین راحت چغتائی کے لئے ادبی دنیا کا یہ ''ستارۂ امتیاز'' ہے۔

اردو ادب میں امین راحت چغتائی تنقید میں بھی اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔اس کا ثبوت ان کی دو کتابیں ''دلائل'' اور ''ردعمل'' پیش کرتی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ روزنامہ ''نوائے وقت'' میں ''ردعمل'' پر ڈاکٹر انور سدید کا تبصرہ شائع ہوا تو کئی لوگ اس کتاب کی تلاش میں مقبول اکیڈمی تک پہنچے حالانکہ امین راحت صاحب نے یہ کتاب چھاپنے کا اعزاز کسی اور اشاعتی ادارے کو دے دیا تھا تاہم میں نے بھی ان کی کتابیں منگوائیں اور اپنے شوروم میں فروخت کے لئے رکھیں۔ان کی دینی کتابوں میں ''قرآن اور نظام حیات'' کو بہت شہرت حاصل ہوئی ''مغل مکتبِ مصوری (سولھویں صدی عیسویں) ان کا تحقیقی کارنامہ ہے۔

امین راحت چغتائی اسلام آباد میں ہیں، میں لاہور میں مقیم ہوں، ملاقات کا موقع ابھی تک نہیں ملا، لیکن ٹیلیفون پر جب بات ہوتی ہے تو ان کی باتوں سے گلاب کے پھولوں کی خوشبو آتی ہے۔ان کا شائستہ لہجہ اور تہذیبی انکسار متاثر کرتا ہے۔ وہ انسانیت کے پاسبان ہیں اور مجھے فخر ہے کہ میں امین راحت چغتائی کے حلقۂ احباب میں ہوں۔

وہ مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے اکثر نوازتے رہتے ہیں، میں ان کا بہت مشکور وممنون ہوں۔

☆☆
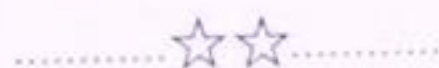
امینہ عنبرین

امینہ عنبرین مقبول اکیڈمی میں پہلی مرتبہ آئیں تو سکول کی ایک طالبہ تھیں اور ان کی دلچسپی خواتین کے ناولوں میں تھیں۔ بالخصوص اے آر خاتون ان کی محبوب مصنفہ تھیں۔ ان کے نئے ناول کی اشاعت کی خبر سنتیں تو اسے خریدنے کے لئے ہمارے ادارے میں آتیں۔ ان کے ذوق وشوق کو دیکھ کر میں نے ایک دن پوچھ لیا ''آپ کو اے آر خاتون کیوں زیادہ پسند ہیں'۔ اس وقت امینہ شاید سکول کی تعلیم مکمل کر چکی تھیں اور خود بھی کہانیاں لکھنے لگی تھیں۔ میرا سوال سن کر فوراً بولیں ''میں بھی افسانہ نگار بننا چاہتی ہوں۔ اے آر خاتون کو پڑھ کر مجھے اپنے رسوم ورواج کا پتہ چلتا ہے''۔ پھر خود ہی کہنے لگیں ''مجھے عبدالحمید عدم اور ساغر صدیقی کی شاعری بھی پسند ہے۔ اور میں اردو کے تمام مشہور شاعروں کی غزلیں اپنے نصاب کی کتابوں میں پڑھ چکی ہوں''۔ یہ کہہ کر وہ تھوڑا سا جھینپی اور پھر کہنے لگی'' اب تو ٹوٹی پھوٹی غزلیں میں خود بھی بنانے لگی ہوں''۔

یہ تمام کہانی مجھے اس وقت یاد آتی ہے تو اس کی وجہ ہے کہ مقبول اکیڈمی سے امینہ عنبرین کا رابطہ 1965ء کی دہائی میں ہوا تھا، وہ ہمیشہ قائم رہا۔ انہیں جب بھی کسی ادبی کتاب کی ضرورت ہوتی تو اسے حاصل کرنے کے لئے مقبول اکیڈمی پر ہی آتیں اور ان کی مطلوبہ کتاب جس ناشر نے بھی چھاپی ہوتی۔ ہم تلاش کر کے امینہ کو فراہم کر دیتے۔ اس دوران میں

نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ امینہ عنبرین کو اپنی انا اور وقار کا ہر وقت خیال رہتا تھا اور مقبول اکیڈمی کے کارکنان ان کے ساتھ ہمیشہ عزت سے پیش آتے تھے۔ ان کا یہ اعتماد اب تک قائم ہے۔

امینہ عنبرین کا اصل نام امینہ صابرہ ہے۔ وہ 6 اپریل 1949ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوئیں۔ لیکن ان کا طالب علمی کا زمانہ ساہی وال میں گزرا۔ اس شہر سے انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ لاہور صرف کتابوں کی تلاش میں آتی تھیں۔ کسی اچھی کتاب کا ذکر اپنی استانیوں سے سنتیں تو اسے حاصل کرنے کی تڑپ ان کے دل میں پیدا ہو جاتی۔ اس مطالعے کی کثرت نے ہی ان کے دل میں خود بھی ادیبہ بننے کا شوق پیدا کر دیا تھا سکول اور کالج کے زمانے میں ہی انہوں نے افسانے لکھنے شروع کر دیئے تھے اور شاعری کے شوق کی آبیاری بھی کر رہی تھیں۔ ان کا وسیع مطالعہ ہی ان کا رہنما تھا اور وہ ملک کے نامور ادبی رسائل مثلاً ''تخلیق''، ''نیرنگ خیال'' اور ''سیپ'' میں چھپنے لگی تھیں۔ اور وہ امینہ صابرہ سے امینہ عنبرین بن چکی تھیں۔ اور شہرت ان کے قدم چوم رہی تھی۔

اس قلمی ریاضت نے انہیں روانی سے لکھنے کی تربیت دی اور اسی تربیت نے ہی امینہ کو صحافی بننے کی ترغیب دی اور انہوں نے 1972 میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے ابلاغیات کر لیا اور باقاعدہ صحافت کو حصول معاش کا وسیلہ بنانے کے لئے اس دور کے مشہور اخبار ''کوہستان'' میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس اخبار میں امینہ خواتین کے روزانہ ایڈیشن کی انچارج تھیں۔ کہنے لگیں ''میں نے اخبار کے صفحے کو اس طرح جدید بنایا کہ گھریلو خواتین بھی کشادہ نظر اور روشن خیال ہو جائیں اور اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دینے اور معاشرے کا ذمہ دار شہری بنانے میں کوتاہی نہ کریں''...... دور دراز کے علاقوں میں انہیں خواتین اپنے نسوانی مشوروں کے لئے خطوط لکھتیں تو وہ بہت خوش ہوتیں اور دکھی عورتوں کی ڈھارس بندھانے، حالات کا مقابلہ کرنے اور خاندانی وحدت کو قائم رکھنے کے لئے خوب مشورے دیتیں۔ حالاں کہ اس دور میں یہ مسائل خود ان کے لئے بھی اجنبی ہوتے تھے۔ لیکن ان کے مشورے اخبار میں چھپتے تو ان کی تعریف میں انہیں خواتین کے بہت سے خطوط ملتے تھے۔

امینہ عنبرین کی شادی 1975ء میں ملک کے نامور ادیب مترجم مصنف اور صحافی مقبول جہانگیر کے ساتھ ہوگئی۔ صحافتی حلقوں میں اس شادی کو مثالی قرار دیا جاتا تھا۔ خوددار، انا پرست اور باوقار امینہ عنبرین اپنے گھر میں ایک خانہ دار خاتون بن جاتیں اور اپنے عظیم شوہر کی خدمت و تابعداری میں کوئی کسر اٹھانہ رکھتیں۔ کہا جاتا ہے کہ مقبول جہانگیر کو جو طمانیت ومسرت امینہ عنبرین نے فراہم کی اسی کا نتیجہ تھا کہ مقبول جہانگیر کے لکھنے کی رفتار شادی کے بعد تیز ہوگئی۔ دونوں کی عائلی زندگی بڑی خوشگوار تھی لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ خوشحال گھرانہ زندگی کی مسرتیں صرف دس سال تک حاصل کرسکا اور مقبول جہانگیر وفات پا گئے تو امینہ عنبرین دنیا میں تنہا ہوگئیں۔

اس عالم میں بھی انہوں نے اپنا عزم قائم رکھا اور صحافت کے پرانے تجربے کو پھر فعال بنایا اور ملک کے مقبول اخبار ''جنگ'' میں ملازمت حاصل کرلی۔ اس اخبار میں انہوں نے مختلف ایڈیشنوں پر کام کیا اور اپنی خداداد صلاحیتوں کا سکہ سب سے منوایا۔ امینہ عنبرین کی خوبی یہ ہے کہ وہ ادبی برادری میں ایک کنبے کی متحدہ فضا بناتی ہیں اور اپنی نسبتوں کو قائم رکھتی ہیں۔ وہ صداقت کا ساتھ دینے والی خاتون ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب ''تخلیق'' کے ایڈیٹر اظہر جاوید کو ایک بڑے ادیب نے عدالت میں گھسیٹا تھا تو امینہ عنبرین نے جو اس مقدمے کے پس منظر سے واقف تھیں اظہر جاوید کا ساتھ دیا اور عدالت کے سامنے وہ سب کچھ بیان کیا جو حقیقت پر مبنی تھا جبکہ اس ادارے کے چند تجربہ کار اور جہاں دیدہ صحافیوں نے بڑی شخصیت کا ساتھ دیا اور عدالت میں حق گوئی سے گریز کیا تھا۔ اس واقعہ نے امینہ عنبرین کی عزت میرے دل میں ہزار گنا کردی۔ اور میرا احساس اب بھی یہ ہے کہ امینہ عنبرین مرد ادیبوں سے زیادہ جرأت مند ادیبہ ہیں۔ میں زندگی میں ان کی کامرانیوں کے لئے دعا کرتا رہتا ہوں۔

☆☆
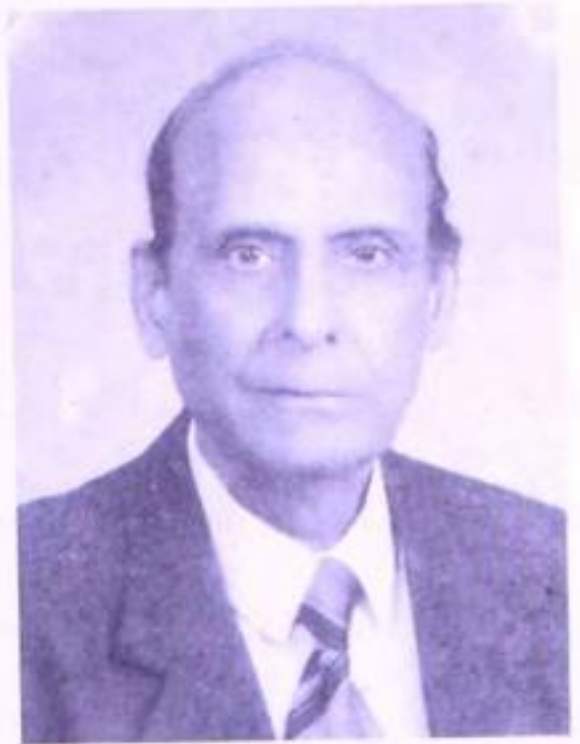
انوار فیروز

انوار فیروز لاہور کم کم آتے ہیں لیکن جب آتے ہیں تو مجھے ملاقات کا موقع ضرور دیتے ہیں۔ نہ آئیں تو ٹیلی فون کے ذریعے دوستوں سے بالعموم اور میرے ساتھ بالخصوص رابطہ قائم کرتے ہیں۔ ان کا ٹیلی فون آئے تو میں انہیں آواز سے پہچان لیتا ہوں۔ ایک طویل عرصے تک میں انہیں صرف شاعر سمجھتا رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے پاس جو ادبی رسالہ بھی آتا اس میں انوار فیروز اپنی ''غزل'' کے ساتھ ضرور موجود ہوتے۔ ایک دن پروفیسر جمیل آذر صاحب نے یہ انکشاف کیا کہ انوار فیروز صرف شاعر نہیں، ان کا شمار اسلام آباد کے نامور صحافیوں میں ہوتا ہے اور وہ ملک کے سب سے بڑے نظریاتی اخبار ''نوائے وقت'' کے ساتھ وابستہ ہیں اب میں ادب اور صحافت کے حوالے سے کہہ سکتا ہوں کہ انوار فیروز ایک نہیں دو سماجی شعبوں کے نمائندہ ہیں۔ اوّل شاعری دوم صحافت آپ انہیں ''ٹو اِن ون'' (Tow in one) کی مثال بھی قرار دے سکتے ہیں۔ عملی زندگی کی بات یہ ہے کہ شاعری انوار فیروز کی محبوبہ ہے اور صحافت ان کی بیوی ہے۔ اور وہ دونوں کے ساتھ شرعی انصاف کر رہے ہیں۔

انوار فیروز 5 جون 1938ء کو بھارت کے مشہور شہر حصار میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد صاحب کا نام ڈاکٹر اظفر حسین اظفر ہے۔ ان کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ اظفر ان کا

تخلص تھا اور وہ شاعر بھی تھے۔ لیکن انوار فیروز نے یہ بات کبھی نہیں بتائی کہ انہیں شاعری کا ذوق ورثے میں ملا ہے۔ ہاں اس بات پر فخر کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کی بڑی صاحبزادی نورین طلعت عروبہ بھی شاعرہ ہے اور ان کی شاعری کی کتابیں اہل ادب تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ انوار فیروز کا پیدائشی نام انوار احمد خان رکھا گیا تھا۔ ان کے والد صاحب کچھ عرصہ فیروز پور میں قیام کیا تھا۔ چنانچہ 1947ء میں پاکستان بنا تو انہوں نے اپنے خاندان کے ساتھ فیروز پور ہی سے ہجرت کی اور پاکستان آکر راولپنڈی میں قیام کیا۔ انہوں نے شاعری کا آغاز کیا تو اپنے نام کے ساتھ فیروز کا لفظ بھی اضافہ کر لیا جو اب تخلص کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن دراصل یہ فیروز پور کی یادگار ہے۔ یہاں مجھے اردو کے معروف شاعر کنول فیروز یاد آرہے ہیں۔ انہوں نے ابتداء میں کنول فیروز پوری کے نام سے شاعری میں قدم رکھا تھا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اظہر جاوید نے انہیں فیروز پوری کنول سے ''کنول فیروز'' بنا دیا۔ اور اب اسی نام سے مشہور ہیں۔

انوار فیروز جب پاکستان میں آئے تو ان کی عمر نو دس برس کی تھی۔ وہ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ ہجرت کے بعد ان کے خاندان کو بے حد نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ تعلیم کا سلسلہ شروع کیا تو کامیابی ان کے قدم چومنے لگی لیکن انہوں نے بیشتر امتحان پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت میں پاس کئے اور اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لئے ٹیوشن پڑھاتے رہے۔ بی اے کرنے کے بعد انہیں ہری پور ہزارہ میں افسر تعلقات عام کی ملازمت مل گئی۔ لیکن درویش مزاج اور غنی انوار فیروز کو یہ شاہانہ نوکری پسند نہ آئی کیوں کہ اس میں افسروں کی چاکری بھی شامل تھی اور انوار فیروز آزاد طبیعت کے سادہ مزاج انسان واقع ہوتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ شاعر بھی تھے۔ جو کچھ دیکھتے وہ سب ان کی شاعری میں اتر آتا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے تعلقات عامہ کی ملازمت سے استعفےٰ دے دیا اور 1962ء میں راولپنڈی کے اخبار ''تعمیر'' کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ یہاں انہیں محسوس ہوا کہ وہ اپنا اظہار شاعری کے علاوہ نثر میں بھی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ صحافت کا پیشہ نہ صرف ان کا وسیلہ حیات بن گیا بلکہ ان کے سماجی خیالات کا عکس بھی اس میں

اتر آیا۔ 1967 میں انہوں نے ایم اے کا امتحان بھی پاس کر لیا۔

لیکن انہوں نے ''کرشن چند ایم اے'' یا شبلی بی کام کی طرح اپنے نام کے ساتھ اپنی اعلیٰ ڈگری کبھی نہیں لکھی۔ اس کی وجہ یہ کہ انوار فیروز نمائش پسند نہیں بلکہ انہیں ''ولی پوشیدہ'' کہنا چاہئے جو نام و نمود سے بے نیاز اپنے اوصاف اور خواص پر پردہ ڈالے رکھتا ہے۔

راولپنڈی کے اخبار ''تعمیر'' میں انہیں باوقار مقام حاصل تھا۔ صحافت کی دنیا میں ان کے نام کا ڈنکہ بجنے لگا تھا۔ لیکن اخبار ''تعمیر'' زیادہ لمبے عرصے تک جاری نہ رہ سکا۔ اب لاہور کے ممتاز نظریاتی اخبار ''نوائے وقت'' دارالحکومت راولپنڈی اسلام آباد نے اشاعت کا آغاز کیا تو انوار فیروز نے اس اخبار میں ملازمت حاصل کر لی۔ واضح رہے کہ ان کے بڑے بھائی منصب معین خان سٹی مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری رہ چکے تھے۔ اور انوار فیروز نے بھی اپنے بچپن میں ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے لگائے تھے اور اپنی نظریاتی بنیاد مضبوط کی تھی۔ ''نوائے وقت'' (راولپنڈی) میں انہوں نے اخبار کے تمام ڈیسکوں (Desks) پر کام کیا اور جناب مجید نظامی سے اپنی اعلیٰ کارکردگی پر اچھی رپورٹیں حاصل کیں۔ چنانچہ اپنے صحافتی فرائض کی ادائیگی کے لئے انہیں سرکاری وفود کے ساتھ ایران، سنگاپور، برطانیہ، جرمنی، امریکہ اور سعودی عرب جانے کا موقع بھی ملا اور یوں انہوں نے سیاحت کے شوق کو بھی پورا کر لیا۔ ان کا ''سفرنامہ یورپ اردو'' کے ممتاز ادبی جریدہ ''اوراق'' میں شائع ہو چکا ہے۔

''نوائے وقت'' راولپنڈی میں ان کی انفرادی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اس اخبار میں ہفتہ وار ''ادبی ایڈیشن شروع کیا۔ چنانچہ یہ کہنا درست ہوگا کہ انوار فیروز راولپنڈی میں صحافت میں ادب کو متعارف کرانے والے صحافی ہیں۔ انہوں نے ادبی صفحے کو علمی اور ادبی مضامین کا مرقع بنا دیا۔ اردو کے سینئر شعراء سے خصوصی طور پر کلام حاصل کیا اور نئے لکھنے والوں کی تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ چنانچہ اب راولپنڈی اسلام آباد میں ادب کی جو

روشنی نظر آتی ہے اسے پھیلانے میں انوار فیروز کا حصہ کسی سے بھی کم نہیں۔

آخری بات یہ کہ وہ ایک طویل عرصے سے شاعری کر رہے ہیں لیکن اپنے کلام کا مجموعہ چھپوانے کی طرف ہمیشہ بے نیازی برتی۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اب ان کی شاعری کی ایک کتاب چھپ چکی ہے اور اس پر اخبارات و رسائل میں خوبصورت تبصرے چھپ رہے ہیں۔

میری خودنوشت ''سفر جاری ہے'' پر انہوں نے ایک بامعنی، باوقار اور خوبصورت تبصرہ کیا ہے۔ میرے نام ان کے ایک مکتوب میں یہ جملہ بڑا بامعنی ہے ''ہماری مشقت کا سفر بھی جاری ہے''۔ میری دُعا ہے کہ انوار فیروز کی کامیابیوں کا یہ سفر جاری رہے۔ آمین!

☆☆
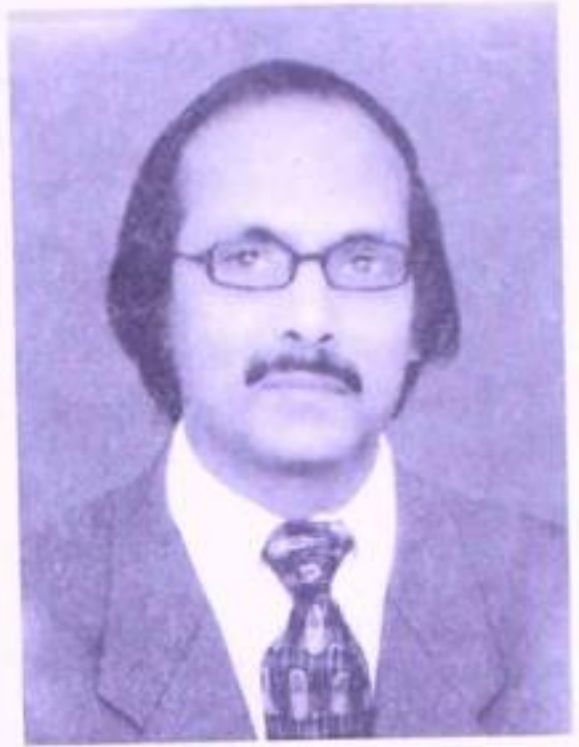
ایم، آر شاہد

ایم آر شاہد صوبہ پنجاب کے محکمہ پولیس میں ایک اعلیٰ دفتری عہدے پر فائز ہیں لیکن ان سے ملاقات ہو تو ان کے چہرے کی معصومیت اور بشاشت کو دیکھ کر کوئی بندہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ پولیس جیسے جابر و قاہر محکمے کے افسر ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ پولیس کی ملازمت ایم آر شاہد کا پیشہ ہے لیکن ادب کا مطالعہ ان کی عبادت ہے۔ وہ جب مصنفین عالم کو پڑھتے ہیں تو محکمہ پولیس کی ساری آلائش دھل جاتی ہے اور وہ تقدیس جو مصنفین کی تحریروں میں چھپی ہوتی ہے ایم آر شاہد کی شخصیت میں جذب ہو جاتی ہے۔

ایم آر شاہد کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ سینئر ادیبوں کے بے حد عقیدت مند ہیں۔ اوران کے سامنے ہمیشہ مؤدب ہو کر بات کرتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی زندہ تھے تو ایم آر شاہد ان سے ملاقات کے لئے روز دفتر ''فنون'' میں جاتے تھے۔ منصورہ احمد انہیں خود چائے بنا کر پیش کرتی۔ قاسمی صاحب کی وفات کے بعد ایم آر شاہد نے انہیں دوسرے لوگوں سے زیادہ یاد رکھا ہے۔ ان کی سالگرہ اور برسی کے دن اپنے گھر میں ہر سال مشاعرہ کرتے ہیں اور اب اس مشاعرے میں منصورہ احمد کے لئے بھی دعائے خیر کراتے ہیں اور لوگوں کو بتاتے ہیں کہ منصورہ احمد سے زیادہ احمد ندیم قاسمی کی خدمت ان کی زندگی کے آخری دور میں کسی نے نہیں کی مرحومین کی وفات ہائے تاریخ پر ان کی کتابوں کو سب اہل قلم نے حوالے کی کتاب تسلیم کیا

ہے۔ میں بھی انہیں داد دیتا ہوں۔

ایم آر شاہد نے عبداللہ ملک صاحب سے بھی حق عقیدت ادا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ملک صاحب کی زندگی میں مشتاق کنول ان کے ادبی کا غذات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ لیکن مشتاق کنول بھی جلد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ چنانچہ عبداللہ ملک کے صاحبزادے ڈاکٹر کوثر پریشان تھے کہ اب ان کے والد صاحب کے بکھرے ہوئے کاموں کو کون سمیٹے گا۔ اس مرحلہ پر ایم آر شاہد نے اپنی خدمات پیش کیں اور ان کی غیر مطبوعہ کتابوں کی اشاعت کا انتظام کیا۔ شاہد صاحب اگر یہ کام نہ کرتے تو عبداللہ ملک کی کتابیں ضائع ہو جاتیں۔ میں نے سنا ہے کہ اب ایم آر شاہد ملک صاحب کی سابقہ کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع کرنے والے ہیں اور اس سلسلے میں ڈاکٹر کوثر صاحب کو اپنی خدمات پیش کر چکے ہیں۔

یہاں اب مجھے اے حمید کے آخری ایام کا ذکر بھی کرنا ہے۔ ان کی علالت کے دنوں میں ایم آر شاہد روزانہ ان کی عیادت کے لئے ان کی رہائش گاہ پر سمن آباد جاتے تھے۔ انہیں ہسپتال منتقل کر دیا گیا تو ایم آر شاہد وہاں بھی تیمارداری کے فرائض انجام دینے کے لئے ہمہ وقت مستعد نظر آتے۔ اے حمید نے اپنی زندگی کا آخری سانس لیا تو اس وقت اپنے بیوی بچوں کے علاوہ ایم آر شاہد ان کے پاس موجود تھے اور دردمندی سے دیکھ رہے تھے کہ اے حمید پر کوئی دوائی کا اثر نہیں ہو رہا اور اردو کا یہ نامور ادیب دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔ اس وقت ایم آر شاہد کا دل رو رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

ایم آر شاہد مقبول اکیڈمی کی کتابوں کے بڑے ذمہ دار قاری ہیں۔ وہ کتاب پڑھتے ہیں تو اس پر اپنی رائے دینے کے لئے بھی اکیڈمی پر تشریف لاتے ہیں اور اچھی کتاب کی بے تحاشا تعریف کرتے ہیں۔ میری تین کتابیں۔ ''سفر جاری ہے''، ''اہل قلم کے خطوط''، ''پذیرائی'' ان کی خدمت میں علامہ عبدالستار عاصم نے پیش کی تھیں۔ اگلے دن ہی اکیڈمی پر شکریہ ادا کرنے کے لئے آئے اور چند روز کے بعد ہی ان کا خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا:

> ''ہماری علمی، ادبی اور اشاعتی دنیا میں بہت کم کم ایسا ہوا ہے کہ ایک آدمی بیک وقت اچھا پبلشر بھی ہو اور ایک اچھا ادیب بھی۔ آپ کی محترم شخصیت میں یہ تمام خوبیاں یکساں ہیں۔ میں سمجھتا

ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آپ پر خاص عنایت ہے اور پیارے
حبیب ﷺ کا صدقہ ہے۔ یہ عزت اور احترام ومقام آج کی دنیا
میں بہت کم لوگوں کے حصے میں آیا ہے''۔

ایم آر شاہد نے بڑے پتے کی بات کہی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے خصوصی انعام واکرام سے نوازا ہے۔ ورنہ کہاں سیالکوٹ کے دیہات کا ایک معمولی آدمی اور کہاں تصنیف وتالیف کا ایسا اعلیٰ مقام جسے ہندو پاک کے ادیبوں نے عزت واحترام عطا کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایم آر شاہد نے میری کتابوں کے آئینے میں خود اپنی شخصیت کے پیکر کو دیکھا ہے۔ جس میں شرافت بھی نجابت بھی اور جو دوسروں کی صداقت پر جتنی تحسین کرنے کا اعلیٰ ظرف بھی رکھتا ہے۔ ایم آر شاہد صاحب میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری کتابیں پسند کیں اور اب میں آپ کی تصویر دیکھ رہا ہوں جو عینک کے شیشوں سے گویا مجھے مخاطب کر رہی ہے اور اپنا خط پڑھ رہی ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ:

''نئے اور پرانے اہل قلم کے خطوط ہماری ادبی تاریخ کا حصہ ہیں۔ انہیں محفوظ کرنے کا یہ بہترین ذریعہ ہے (مراد کتاب ''اہل قلم کے خطوط'' سے ہے) یہ خطوط لکھنے والوں میں اکثر مشاہیر زمین کی آغوش میں یہ کہتے ہوئے کہ

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

ابدی نیند کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ مگر ان کی تحریریں یادوں کی صورت میں زندہ ہیں...... وہ یادیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گی''۔

ایم آر شاہد کے بارے میں اپنے تاثرات لکھنے کے لئے میں عرصے سے بے تاب تھا لیکن پتہ نہیں چلتا تھا کہ سرا کہاں سے پکڑوں۔ آج خبر پڑھی کہ انہیں ادبی خدمات پر صدر پاکستان نے ''تمغۂ امتیاز'' دیا ہے کہ تو میں انہیں مبارکباد پیش کرنے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔

☆☆
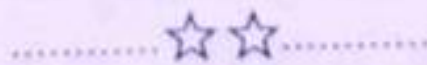
بشیر موجد

بشیر موجد ملک کے نامور مصور ہیں جن کا موقلم رنگ بکھیرتا ہے تو کاغذ پر کائنات کی نیرنگیاں اجاگر ہو جاتی ہیں اور رنگوں کی آمیزش سے نئے معانی تلاش کرنے کی دعوت ملتی ہے۔ ان کا تعلق حقیقت نگاری کے اس دبستان سے ہے جسے استاد اللہ بخش نے فروغ دیا اور پنجاب کے دیہی کلچر کو حیات دوام عطا کر دی تھی۔

بشیر موجد 1930ء میں فتح گڑھ ضلع لاہور میں پیدا ہوئے ان کا پیدائشی نام بشیر احمد ہے۔ یہ اگست کا مہینہ تھا اور تاریخ 14 تھی جس کی اہمیت یہ ہے کہ سترہ برس بعد ٹھیک اس دن پاکستان ظہور میں آیا تھا۔ ان کا بچپن اور لڑکپن لاہور کے تحریکی نعروں میں پروان چڑھا شعور بیدار ہوا تو تحریک پاکستان اپنے عروجی دور میں داخل ہو چکی تھی اور لاہور کی سڑکوں پر پنجاب کے وزیر اعلیٰ ملک خضر حیات کے خلاف جلوس نکالے جا رہے تھے جو انگریزوں کا حامی اور مسلم لیگ کا مخالف تھا۔ اس تحریک میں اپنی جوانی کا جوش اور ولولہ شامل کرنے کے لئے بشیر احمد نے بھی مسلم لیگ نیشنل گارڈ سے وابستگی اختیار کر لی اور تحریک پاکستان کو کامیاب بنانے کے لئے عملی حصہ لینے لگے۔ ان کی قومی خدمات پر انہیں تحریک پاکستان کا فعال کارکن ہونے اور اعلیٰ خدمات انجام دینے پر ''گولڈ میڈل'' عطا کیا گیا۔

پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا تو بشیر احمد کے سامنے زندگی کے تقاضے منہ کھولے

کھڑے تھے۔ ملک میں ایک نیا کلچر مرتب ہو رہا تھا۔ لاہور فسادات کی زد میں آ گیا تھا اور پھر جب اعلانِ قیامِ پاکستان ہو گیا تو ہندو اور سکھ لاہور چھوڑ کر جانے لگے اور جالندھر، ہوشیار پور اور امرتسر کے فسادات کی زد میں آئے ہوئے مسلمان اپنی جانیں اور عزتیں بچا کر لاہور آنے لگے اس کرب ناک دور میں بشیر احمد کے دل میں جو درد پیدا ہوا اس نے شاعری کی صورت اختیار کر لی۔ اس مرحلے پر ان کی زندگی میں احسان دانش داخل ہوئے اور انہوں نے اس نوجوان کے شعروں کو خون رنگ دیکھ کر محسوس کیا کہ وہ حقیقت کو مصور کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ محسوس کی کہ شاعری سے مشاعروں میں داد گو خوب ملتی ہے لیکن یہ انسان کو معدے کی بھوک سے نجات نہیں دلاتی۔ احسان دانش انہیں ایک پریکٹیکل انسان بنانا چاہتے تھے۔ وہ اپنے انار کلی والے بالا خانے سے بشیر احمد کی انگلی پکڑ کر اترے اور لاہور کے ممتاز مصور سرفراز سید کے پاس لے گئے کہ اسے اپنا شاگرد بنا لیں۔ استاد نے شاگرد کا جوہر پہلے دن ہی پہچان لیا، اور اس کے ہاتھ میں برش پکڑا دیا۔ اب وہ بشیر موجد بن چکے تھے۔ کیوں کہ وہ رنگوں کو صرف استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے مسیحا تھے اور ان کے اندر سے تصویر ایجاد کرتے تھے۔

مصور سرفراز نے بشیر موجد کی مصوری کے جوہر کو خوب چمکایا۔ اس دور میں مصور مشرق عبدالرحمان چغتائی کا ڈنکا نیاز مندانِ لاہور نے پورے ملک میں بجا رکھا تھا۔ بشیر موجد بھی ڈنکے کی اس آواز سے متاثر ہو رہے تھے چنانچہ ایک روز عبدالرحمان چغتائی کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور انہوں نے معاون کی حیثیت میں انہیں قبول کر لیا۔ بشیر موجد کہتے ہیں کہ میں حقیقت نگاری کا فن استاد سرفراز سے اور غالب کے شعر کی باریک لکیروں سے صورت گری کا فن مصور مشرق عبدالرحمان چغتائی سے سیکھا ہے اور پھر ان دونوں کے امتزاج سے اپنے فن کی نئی صورت گری کی ہے۔

بشیر موجد صرف فطرت کے مناظر اور انسانی چہروں کی مصوری ہی نہیں کرتے انہوں نے مصورانہ خطاط میں بھی انفرادیت پیدا کی۔ حضرت داتا گنج بخش کمپلیکس کی خطاطی کے لئے جو آٹھ خطاط منتخب کئے گئے تھے ان میں بشیر موجود بھی شامل تھے اور اب ان کا نام

اس کمپلیکس کے صدر دروازے پر کندہ کیا گیا ہے 2007ء میں صدر پاکستان نے انہیں تمغہ امتیاز پیش کیا۔

بشیر موجد کے باطن میں جو شاعر چھپا ہوا تھا اس کی تخلیقی صورت اب مصوری میں ظاہر ہونے لگی۔ میں نے ان کی مصوری کے چند شاہکار دیکھے تو بے اختیار کہہ اٹھا یہ رنگوں میں شاعری ہے۔ ان کی تصویریں جامد نہیں ہیں بلکہ دیکھنے والے کے دل کو داخلی موسیقی سے فرحت یاب کرتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اب بشیر موجد نے ادیبوں اور تخلیق کاروں سے رشتہ وتعلق پیدا کر لیا۔ ان کی کتابوں کے سرورق بنانے لگے۔ ادبی رسائل کو اپنی مصوری سے سجانے لگے۔ کہنے لگے کہ انہوں نے استاد عبدالرحمان چغتائی کو دیکھا کہ وہ کتابوں کے سرورق بنانے کا معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ بلکہ مصنف کی خدمت میں بلا قیمت پیش کر دیتے تھے۔ میں نے بھی اپنی زندگی میں کتاب کا سرورق بنانے کا کبھی معاوضہ نہیں لیا۔ اور اسے اپنا اعزاز سمجھتا ہوں کہ تخلیق کار سے لوگ ملاقات کرتے ہیں تو ان کی پہلی نظر میرے بنائے ہوئے سرورق پر پڑتی ہے۔ چنانچہ اب بشیر موجد ہر لائبریری میں موجود ہے اور پڑھے لکھے گھرانے کے ہر بک شیلف پر ان سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

بشیر موجد اس بات پر بھی فخر کا اظہار کر سکتے ہیں کہ انہیں نہ صرف احسان دانش کا دستِ شفقت حاصل رہا بلکہ وہ ملک کے مشہور ادیب، شاعر اور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کے قریبی دوستوں میں سے بھی تھے۔ اور ''فنون'' جاری ہوا تو اس کا آغاز کرنے میں ان کی مساعی بھی عملی طور پر شامل تھی۔ اس کے ساتھ ہی انہیں ڈاکٹر وزیر آغا کا تعاون بھی حاصل تھا۔ اور انہوں نے احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کے آخری لمحات تک ان سے اپنے تعلقات قائم رکھے۔ میں نے ایک دن مذاق سے کہا ''موجد صاحب آپ نے دو کشتیوں میں پاؤں رکھا ہوا ہے؟'' ہنس کر کہنے لگے ادب کی ایک ہی کشتی ہے اور قاسمی صاحب اور آغا صاحب دونوں اس کشتی میں سوار ہیں۔ ان کے ساتھ میں بھی لہروں سے کھیل رہا ہوں۔

مجھے فخر ہے کہ میں نے مقبول اکیڈمی کی کتابوں کے لئے جب بھی ان سے سرورق

بنانے کی درخواست کی انہوں نے اسے شرفِ قبولیت عطا کیا اور خوبی یہ ہے کہ مجھے کبھی یاد دہانی کی ضرورت نہیں پڑی۔ بعض اوقات تو میں کسی مصنف سے اشاعت کے لئے کتاب حاصل کرتا تو وہ شرط لگا دیتے کہ اس کا سرورق بشیر موجد صاحب سے بنوایا جائے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اب تک ہزاروں کتابوں کو اپنے موقلم سے زیب و زینت عطا کر چکے ہیں۔ اب کچھ عرصے سے بیمار رہنے لگے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ اندرونِ لاہور سے اٹھ کر لاہور کی ایک دور افتادہ کشادہ بستی میں چلے گئے ہیں۔ اب ان سے ملاقات کم کم ہوتی ہے لیکن ٹیلی فون کا رابطہ قائم ہے۔ وہ فون کریں تو ٹیلی فون کی گھنٹی ایک خاص انداز میں بجتی ہے۔ اور میرا دل کہتا ہے کہ دوسری طرف بشیر موجد صاحب ہیں۔ اور واقعی وہی ہوتے ہیں۔ میں ان کی صحت مند زندگی کے لئے دُعا گو ہوں۔ لاہور کی ناموری میں بشیر موجد کی خطاطی کا بڑا حصہ ہے۔ ان کا انکسار محبتوں کا رہین ہے۔ ان کی فکر دلنواز ہے۔ اور وہ دوستوں کے سچے دوست ہیں۔

☆☆
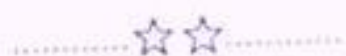
پرتو روہیلہ

بہت عرصے کی بات ہے کہ ایک دن پروفیسر تنویر حسین جو اردو کے ایک اچھے مزاح نگار ہیں اور مرزا غالب کی طرح پورے پکے ہوئے میٹھے آموں کے شوقین ہیں۔ میرے ادارے مقبول اکیڈمی پر آئے تو خلاف معمول ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جس کا نام تھا ''سفر گشت'' اور مصنف کا نام تھا ''پرتو روہیلہ''۔ مجھے کتاب کے نام سے زیادہ مصنف کے نام نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میرے ذہن میں یہ بات بھی راسخ تھی کہ ''روہیلہ'' ایک جنگجو قبیلہ تھا۔ اور تلوار کو کبھی نیام میں نہیں ڈالتا۔ کیا اب روہیلوں نے تلوار رکھ دی ہے؟ اور قلم سنبھال لیا ہے؟ اس قسم کے سوالات میرے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے کہ پروفیسر تنویر حسین نے مجھے مزید حیران کر دیا کہ ان کی شاعری کی کتاب کو اس سال کا اکیڈمی ایوارڈ ملا ہے۔ دوسری بات یہ بتائی کہ پرتو روہیلہ صاحب محکمہ انکم ٹیکس کے جج ہیں اور جی پی او کے سامنے ان کا دفتر ہے۔ میں نے پوچھا ''اتنے بڑے افسر ہیں تو ہم جیسے لوگوں سے کم کم ملتے ہوں گے''۔ اب مزاح نگار تنویر حسین کھکھلا کر ہنسا اور بولا...... ملک صاحب! پرتو روہیلہ تو درویش مزاج آدمی ہیں، انہوں نے افسری کو اپنے اوپر نہیں لادا۔ اور ادیبوں کو تو بڑی محبت سے ملتے ہیں۔ میں آپ کو کسی دن ان سے ملواؤں گا۔ تنویر حسین نے ملاقات کا یہ وعدہ پورا نہیں کیا لیکن میں نے ان کا سفر نامہ جو بہت عرصہ پہلے چھپا تھا پڑھا تو حیرت ہوئی کہ وہ امریکہ دیکھ

رہے تھے لیکن انہوں نے مشرق کی اخلاقیات کو اپنے اوپر طاری کر رکھا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سفرنامہ نگار وطن سے نکلتے ہی ہیرو بن جاتا اور اپنی صورت شکل اتنی خوبصورت اور عادات و اطوار ایسی عاشقانہ پیش کرتا کہ یورپ، امریکہ، فرانس اور کینیڈا کی لڑکیاں اس پر جی جان سے فدا ہو جاتیں۔ اور سفرنامہ نگار ہیرو کے روپ میں ہر ملنے والی لڑکی پر فتح حاصل کر لیتا۔ لیکن جب وطن واپس آتا تو لڑکی تو کیا کوئی ہیجڑا بھی اسے گھاس نہ ڈالتا۔ اور کتاب لکھتا تو اپنی کامرانیوں کی داستان دلکش اسلوب میں پیش کرتا۔ پاکستان میں اس قسم کے سفرنامے بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ لیکن پرتو روہیلہ کے سفرنامے میں مجھے ایک لڑکی بھی نظر نہیں آئی جس نے پرتو روہیلہ کی طرف دیکھا ہو یا پرتو روہیلہ نے کسی حسینہ کو اپنی آنکھ کی جھپک میں قابو کر لیا ہے۔ لیکن یہ سفرنامہ اتنا دلچسپ ہے کہ میں نے ایک سرے سے شروع کیا تو آخری صفحے تک رات بھر جاگ کر ختم کر ڈالا۔ پرتو روہیلہ نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں نے اگلے روز مقبول اکیڈمی میں آتے ہی انہیں اپنی کتاب ''سفر جاری ہے'' ڈاک کے ذریعے بھیج دی۔

میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا کہ ان کی کتاب کا مطالعہ میں نے اس وقت کیا جب وہ اپنی اعلیٰ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو کر اسلام آباد چلے گئے تھے۔ کتاب ملتے ہی انہوں نے رسید بھیجی۔ اور میری اس معمولی سی کاوش کو اس قدر سراہا کہ میری عزت میری اپنی نظروں میں زیادہ ہو گئی۔ تنویر حسین اس روز مقبول اکیڈمی پر آئے تو میں نے انہیں دکھایا اور فخر سے کہا دیکھ تنویر حسین۔ ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے؟''

تنویر حسین نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ کرسی سے اٹھا اور انارکلی بازار سے تازہ لڈو کا ڈبہ لے آیا۔ بولا ''اب میری مبارکباد قبول فرمائیں''...... اس روز سے پرتو روہیلہ کو میں اپنے دل کے قریب محسوس کرنے لگا ہوں اور ان کا خط کئی دوستوں کو دکھا چکا ہوں۔

جناب پرتو روہیلہ کا نام میونسپل کمیٹی کے رجسٹر میں مختار علی خان لکھا ہوا ہے۔ لیکن ادبی دنیا اس نام سے واقف نہیں۔ مشرق سے مغرب تک وہ پرتو روہیلہ کے نام سے پہچانے

جاتے ہیں اور انہوں نے ''پرتو شب''، ''رین اجیارا''، ''نوائے شب''، ''دام خیال''، ''آواز، اور، ''ایک دیا دریا میں'' کے عنوان سے شاعری کی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے فکروفن پرلاہور کے مشہور اشاعتی ادارے نے کتاب مرتب کرائی۔ اور شائع کی تھی۔ آپ 10 اگست 1933ء کو صوبہ سرحد میں پیدا ہوئے۔ پشاور یونیورسٹی سے ایم اے اور ایل ایل بی کے امتحانات پاس کئے اور مقابلے کا امتحان پاس کر کے اپنے میرٹ پر محکمہ انکم ٹیکس میں افسر بن گئے۔ انہوں نے اس محکمے میں اسلام آباد، کراچی، پشاور اور لاہور میں خدمات انجام دیں اور اپنی محنت اور دیانت کا نقش ہر جگہ قائم کیا۔ میں نے ایک مرتبہ عبدالعزیز خالد صاحب سے پوچھا کہ آپ کے محکمہ میں کوئی اور شاعر بھی پیدا ہوا ہے جو اپنے پیشے اور شوق سے انصاف کرتا ہو...... ''عبدالعزیز خالد سوچ میں پڑ گئے اور پھر ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ بولے'' میں پرتو روہیلہ کا نام ہی لے سکتا ہوں'' مجھے خوشی ہوئی کہ یہ سوال کرتے وقت میرے ذہن میں بھی اُن کا نام ہی تھا۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ صدرِ پاکستان نے ان کو 1993ء میں پرائیڈ آف پرفارمنس پیش کیا تھا وہ ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو سی بی آر اسلام آباد میں جوڈیشل کمشنر کے عہدے پر فائز ہوئے دلچسپ بات یہ ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں فراغت ملی تو انہوں نے مرزا غالب سے لو لگالی۔ دوسرے پاکستانی ادیب تو غالب کی اردو شاعری اور اردو خطوط کے مطالعے میں غلطاں تھے لیکن پرتو روہیلہ نے غالب کے فارسی خطوط کا مطالعہ شروع کر دیا اور حیران ہوئے کہ ان کا ذکر کبھی کسی نقاد نے نہیں کیا۔ انہوں نے فارسی خطوط کو اردو میں ترجمہ کرنے کی ٹھانی اور پھر اپنے جنون کو فارغ نہ بیٹھنے دیا۔ غالبیات کے سلسلے میں ان کی کتابیں ''نامہ ہائے فارسی''...... ''آہنگ پنجم'' اور ''معاصر غالب'' اور ''متفرقات غالب'' وغیرہ چھپ چکی ہیں۔ خطوط فارسی کے تراجم کا ایک کلیات بھی شائع کر چکے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ اس تمام کام کا کریڈٹ جناب مشفق خواجہ کو دیتے ہیں جنہوں نے غالب کے خطوط کے ترجمے پر ان کی حوصلہ افزائی کی تھی اور پھر اس کام میں اتنی محبت پیدا کر دی کہ پرتو روہیلہ بھی غالب کے ساتھ اس وابستگی کو عمر بھر کا حاصل سمجھنے لگے۔ اور اب عالم یہ ہے کہ وہ پہلے سوتے جاگتے غزلیں لکھتے تھے۔ اب ہر وقت غالبؔ کے

کسی نئے زاویے پر کام کرنے کا سوچتے رہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ غالبؔ عقبیٰ میں خوش ہوں گے کہ انہیں پرتو روہیلہ جیسا عقیدت مند مل گیا ہے جس نے اپنی زندگی غالبؔ کے ابلاغِ عام کے لئے وقف کر رکھی ہے۔

پرتو روہیلہ پاکستان کے ان تھوڑے سے ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں جن کے بارے میں سب محبت کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی علمی دوستی کو سراہتے ہیں ان کی نفاستِ طبع کی داد دیتے ہیں اور سند عطا کرتے ہیں کہ وہ اکیسویں صدی کے حلیم ترین اور خلیق ترین انسان ہیں۔

............☆☆............
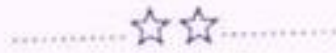
جان کاشمیری

جان کاشمیری فرد نہیں بلکہ کئی افراد کا مجموعہ ہے۔ اسے دیکھیں تو خیال آتا ہے کہ ان کا وطن ضرور گوجرانوالہ ہے جہاں اکہری پسلی کا بندہ نظر نہیں آتا۔ بلکہ ایک بندے میں استعمال شدہ میٹیریل سے لکھنؤ کے کم از کم چار بانکے تعمیر کیے جا سکتے ہیں۔ یہ اجمال جان کاشمیری کے تن و توش کا ہے۔ اس کی تخلیقی سرگرمیوں کا حال دیکھیں تو وہ لاہور کے آٹھ ادیبوں سے زیادہ کام کرتے ہیں صبح کے وقت غزل لکھتا ہے۔ اشراق کے بعد قطعہ نگاری کرتا ہے۔ ظہر سے پہلے انشائیہ رقم کرتا ہے۔ ظہر کے بعد نظم گیت یا کسی ادیب کا خاکہ لکھتا ہے۔ اس دوران وہ اپنے دفتر کے فرائض منصبی بھی ادا کرتا ہے۔ اور سینکڑوں لوگوں کی شکایات نمٹاتا ہے۔ اس روز کی کسی تقریب کے لئے دعوت نامہ ملا ہو تو اپنی گاڑی کا رخ تقریب گاہ کی طرف کر دیتا ہے۔ واپس آ کر اس تقریب کی رپورٹ مرتب کرتا ہے اور دنیا بھر کی اردو ویب سائیٹوں کو بھیج دیتا ہے۔ بلاشبہ وہ معروف شاعر اور انشائیہ نگار ہے اور اردو کے کاہل ادیبوں کے ہجوم میں اپنے کام کی کثرت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کا نصب العین ہے کام، کام اور مزید کام لیکن وہ دوسروں کو بھی ادبی کام میں مصروف رکھتے ہیں اس کام کی تکمیل کے لئے اس نے رسالہ ''قرطاس'' جاری کر رکھا ہے جس کے عام پرچے کی جسامت چار صد صفحات سے کم نہیں ہوتی اور سالنامے کی ضخامت ہمیشہ ایک ہزار صفحات سے زیادہ ہوتی

ہے۔ اتنے ضخیم رسالے کا پیٹ بھرنے کے لئے اس نے اردو دنیا کے تمام ادیبوں کو مصروف کر رکھا ہے۔ ''قرطاس'' پڑھنے والے تو شکایت کرتے ہیں کہ ابھی ایک پرچہ پورا پڑھا نہیں تھا کہ دوسرا آ گیا ہے۔ جان کاشمیری کہتا ہے کہ ''قرطاس'' کو محفوظ کرلو۔ آج کا قاری اگر اسے پورا پڑھ نہیں سکا تو اسے قاری کی اگلی نسلیں پڑھیں گی۔

جان کاشمیری کا خاندانی نام محمد نصیر بٹ ہے۔ وہ 15 اپریل 1953ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوا۔ لسی نوشوں اور چڑی خوروں کے اس شہر میں جان کاشمیری نے تعلیم کی منزلیں طے کرنے کے بعد زندگی کو طمانیت سے گزارنے کے لئے انجینئرنگ کا شعبہ پسند کیا اور واپڈا میں ملازمت شروع کی تو اسے ایس ڈی او کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ ریٹائرمنٹ کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ ضرور چیف انجینئر یا ایس ای کے عہدے پر ترقی پا جائے گا۔ لیکن وہ پیشہ وارانہ ترقیوں کو اہمیت نہیں دیتا اور سب سے زیادہ فخر اپنی تخلیق کاری کو دیتا ہے جس کی سب اصناف پر اسے پوری قدرت حاصل ہے۔

ویسے تو جان کاشمیری کو اردو ادب کی سب اصناف سے محبت ہے لیکن غزل سے ان کا عشق جنون کو پہنچا ہوا ہے۔ ایک زمانے میں وہ پندرہ بیس اشعار کی غزل کہہ کر نئی زمین کی تلاش میں مگن ہو جاتا تھا۔ لیکن اب وہ لمبی غزل کہنے لگا ہے۔ اگلے روز مجھے ''تخلیق'' کے ایڈیٹر اظہر جاوید نے بتایا کہ جان کاشمیری نے دنیا کی طویل ترین غزل لکھ دی ہے اور وہ اس کا نام عالمی ریکارڈوں کی کتاب میں درج کروانے والے ہیں۔ میں نے اظہر جاوید سے پوچھا ''جان کاشمیری کس استاد کا فیض یافتہ ہے''۔ انہوں نے جواب دیا کہ جان کاشمیری اپنا استاد آپ ہے۔ رسمی طور پر اس نے گوجرانوالہ کے قادرالکلام شاعر اثر لدھیانوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اور تازگی اور توانائی سے شاعری کرنے کے اسرار و رموز سیکھے۔ لیکن اس کے اندر شاعری کی مشین لگی ہوئی ہے۔ پرانے زمانے میں شعرا اپنے دل میں محبوب کی تصویر سجایا کرتے تھے اور جب چاہتے اس تصویر کو گردن جھکا کر لکھ لیتے تھے۔ اپنے محبوب سے ملاقات کر لیتے تھے۔

جان کاشمیری ادب میں وارد ہوئے تو ان کی عمر صرف 45 سال تھی۔ یعنی پیدائش کا

سال 1953ء اور پہلی تخلیق کا سال 1968ء ہے۔ اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ہونہار پروا کے چکنے چکنے پات اس کے بچپنے میں ہی ظاہر ہونے لگتے تھے۔ لیکن میں اسے ایک اور نظر سے دیکھتا ہوں۔ یعنی ''جان'' پیدا ہوتے ہی دنیا کے مشاہدات اور تجربات سمیٹنے لگا تھا۔ آغازِ حیات سے اس کا شعور بیدار ہو گیا تھا اور جب تعلیم کی منزلیں کرنے لگا تو ان سب سے ادب بھی تخلیق کرنے لگا۔ 2011ء میں وہ اپنی عمر عزیز کے 56 گزار چکا ہے۔ اور اب تک اس کی جو کتابیں چھپ چکی ہیں وہ انگلیوں پر گنی نہیں جا سکتیں۔ آپ صرف نام سن لیجیے۔

غزل کی کتابیں۔ ''اعراف''، ''برجستگی''، ''جدائی اک جزیرہ''، ''چلو تو ساتھ چلو''، ''حیرت سے آگے'' اور ''خلوت کے بعد'' غزل کی کئی کتابیں زیرِ طبع ہیں اور اس سے زیادہ کتابیں زیرِ تکمیل ہیں۔

انشائیوں کا مجموعہ...... ''رات کی رانی''

خاکے...... ''گل برائے دیگراں''

انٹرویوز...... ''سچ کی عادت''

جان کاشمیری ادب کے فروغ کو اپنی زندگی کا نصب العین شمار کرتا ہے۔ چنانچہ کئی رسائل کی ترتیب و تدوین شامل کر رہا ہے۔ ان میں رسالہ ''محفل'' رسالہ ''روزن انٹرنیشنل'' اور رسالہ ''شام و سحر'' شامل ہیں اپنا ماہنامہ ''قرطاس'' چند سال پہلے جاری کیا تھا۔ لیکن تخلیقی سرگرمیوں اور ملازمت کی مصروفیتوں میں اسے ماہوار بنیادوں پر جاری نہ رکھا جا سکا تو جان کاشمیری نے اسے سہ ماہی رسالہ بنا دیا۔ اب یہ رسالہ پابندی وقت کے ساتھ گزشتہ کئی برسوں سے شائع ہو رہا ہے اردو ادب میں اپنی دھاک بٹھا رہا ہے۔ ''قرطاس'' کو جان کاشمیری نے اظہار کے ایک آزاد فورم کی حیثیت دے رکھی ہے اور اس میں ہر طبقۂ خیال کا ادیب اپنی بات اپنے انداز میں کر سکتا ہے۔

جان کاشمیری میرے پرانے دوستوں میں سے ہے گوجرانوالہ سے اکثر لاہور آتا ہے تو مقبول اکیڈمی پر آ کر ملاقات کا شرف خود عطا کرتے ہیں۔ میری کتاب

''سفر جاری ہے'' چھپی تو اس پر جان کاشمیری نے مضمون لکھ کر اپنی اعلیٰ ظرفی اور کشادہ نظری کا ثبوت دیا۔ میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ جان کاشمیری اردو ادب کا قیمتی اثاثہ ہے اور ادب کا مؤرخ انہیں ہمیشہ خراجِ تحسین پیش کرتا رہے گا۔

رسالہ ''قرطاس'' میں میری خودنوشت ''سفر جاری ہے'' پر ان کا مقالہ ان کی اعلیٰ ظرفی اور کشادہ نظری کا ثبوت ہے۔

............☆☆............
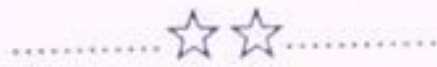
جاوید اختر بھٹی

اولیاؤں کے شہر ملتان میں 2 فروری 1958 کو ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام ان کے والدین نے جاوید اختر رکھا۔ کہتے ہیں کہ جب جاوید اختر پیدائش کے بعد ہاتھ پاؤں مارنے لگا تو پلنگ پر اخبار پڑی تھی۔ جاوید اختر نے اس اخبار تک رسائی حاصل کی اور اٹھا کر آنکھوں پر رکھ لی۔ اس وقت سے جاوید اختر کا رشتہ چھپے ہوئے کاغذ سے قائم ہے۔ سکول کے زمانے میں وہ اردو میں مضمون لکھتے تو استاد سمجھتے کہ کہیں سے نقل کر کے لایا ہے یا پھر کسی بڑے نے اسے لکھ کر دیا ہے۔ لیکن جب کمرۂ جماعت میں بیٹھ کر استاد اور طلبہ کے سامنے مضمون لکھنے لگا تو اس کے اساتذہ نے پیش گوئی کر دی کہ جاوید اختر بڑا ہو کر ادیب بنے گا۔ اور یہ بات بعد میں سچ ثابت ہوئی۔ اور ان کا شمار ملتان کی نئی نسل کے ان ادیبوں میں ہوا جنہوں نے ادب سے عشق کیا۔ اور ادب کو کمائی کا وسیلہ نہیں بنایا اور اپنی ادبی شناخت کے لئے نام کے ساتھ بھٹی کا اضافہ کر لیا۔

اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جاوید اختر بھٹی نے دو ٹکے کی سرکاری نوکری نہیں کی۔ بلکہ ایک ادیب کی حیثیت میں اپنی تحریر کی آزادی کو برقرار رکھا۔ بے شمار کتابوں کے مطالعے نے ان کی سوچ کا دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ ہر کتاب اسی زاویے سے پڑھتے کہ یہ صرف آخر نہیں ہے اور پھر ان کے مطالب پر اپنے نقطۂ نظر سے غور کرنے لگتے۔ ان کی نوجوانی کا دور

عالمی مصنفین کے سائے میں گزراوہ صداقت کی جستجو میں سرگرم عمل ہوئے تو تحقیق کی طرف آ گئے۔ انہوں نے ملتان کے گم شدہ ادبی خزینوں سے بہت سے نوادر تلاش کیے ہیں اور فراموش شدہ ادیبوں کے تذکرے لکھ کرانہیں نئی زندگی دی ہے۔

شخصیات نگاری پر ان کی دو کتابیں اب حوالے کے طور پر استعمال ہوتی ہیں ڈاکٹر راؤ طاہر صاحب، ملتان میں سرکاری ملازمت کے سلسلے میں آئے تو انہیں ملتان کی تاریخ میں جھانکنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ اس مشکل کام میں ملتان میں ان کی سب سے زیادہ معاونت جاوید اختر نے کی اور انہیں کئی نایاب اور کمیاب کتابوں کا پتہ دیا جو ایک لائبریری کے تاریک کونوں میں پڑی تھیں اور ان پر کسی نے عرصے سے نظر نہیں ڈالی تھی۔

جاوید اختر بھٹی تخلیق کار بھی ہیں۔ اپنے تخلیقی اظہار کے لئے انہوں نے نثر کا اسلوب اختیار کیا۔ اور افسانہ لکھنے لگے۔ ان کی نظر میں افسانہ محض قصہ نگاری نہیں بلکہ یہ زندگی کا بیانیہ بھی ہے اور معاشرے کی تنقید بھی اس میں سما جاتی ہے۔ ''چاند کے زخم''، ''مگر تم زندہ رہنا''...... اور ''ربی ذات'' ان کے افسانوں کی کتابیں ہیں جن کی پذیرائی ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں وسیع پیمانے پر ہوئی۔ ڈاکٹر انور سدید نے ان کتابوں پر اخبار ''نوائے وقت'' میں تبصرے لکھے تھے۔ چنانچہ مقبول اکادمی پر ہر تیسرا گاہک جاوید اختر بھٹی کی کتاب طلب کرتا اور بتاتا کہ اس نے ''نوائے وقت'' میں تبصرہ پڑھا ہے۔

تحقیق کے زاویے سے جاوید اختر بھٹی نے اُردو ہندی تنازعے پر ایک تاریخی کتاب پیش کی ہے۔ پال کشن بترہ ملتان کے ایک قدیم شاعر تھے جن کا خاندان 1947 میں ہندوستان چلا گیا تھا اور اپنے ساتھ ان کی متاع ادب بھی لے گیا۔ جاوید اختر بھٹی نے ملتان کے کسی رسالے میں بترہ صاحب کا کلام پڑھا تو ان کے حالاتِ حیات اور کلام کی تلاش کرنے لگے۔ ان کا یہ تحقیقی کارنامہ ''ابر گہربار'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ ''فیضان آزاد'' مولانا ابوالکلام آزاد کے رسالہ الہلال اور البلاغ کے اشارات اور مباحث پر مبنی ہے۔ ان کی تحقیقی کتاب ''اخوان الصفاء'' پر لاہور کے ایک ناشر نے ڈاکہ ڈالا تھا اور اپنے نام سے

چھپوالی تھی۔ جاوید اختر بھٹی نے اس کا پیچھا کیا اور کاپی رائٹ ایکٹ کے تحت عدالت میں گھسیٹنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن کچھ دوستوں نے معاملہ رفع دفع کرا دیا۔

یہاں جاوید اختر بھٹی کی جائزہ نگاری بھی قابل ذکر ہے۔ ڈاکٹر انور سدید تو پورے ادب کا سالانہ جائزہ لکھتے رہے ہیں لیکن جاوید اختر بھٹی نے 1985ء اور 1986ء میں صرف ملتان کے ادب کے ہر دو طویل جائزے لکھے۔ اور انہوں نے ان جگنوؤں کو بھی مطلع ادب پر روشن کر دیا جنہیں ڈاکٹر انور سدید جائزے کے وسیع تناظر میں نظر انداز کر دیتے تھے۔

جاوید اختر بھٹی ملتان کے متعدد اخبارات میں ادبی، تہذیبی اور سیاسی کالم لکھتے رہے ہیں۔ ادبی کالموں کی ''حاشیے'' چھپ چکی ہے۔ ملک کے تمام ممتاز ادبی پرچوں میں ان کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ وہ ''غلطی ہائے مضامین'' کو فوراً نشان زد کرنے والے ادیب ہیں اور جب تحقیق و تنقید سے تھک جاتے ہیں تو ٹیلی فون گھمانے لگتے ہیں۔ پاکستان کے سب ادیبوں سے ان کے تعلقات بڑے خوشگوار ہیں وہ ان کی کتابوں پر مثبت تبصرے کرتے اور رسائل میں چھپوا دیتے۔ ملتان کے دو تین نوجوان جوان کے ادبی معاصر ہیں ان سے ناراض رہتے ہیں۔ مقامی یونیورسٹی کی ناہمواریوں پر بھی ان کی نظر رہتی ہے۔ وہ ادب کی تعلیم میں کھوٹ کو پسند نہیں کرتے۔ اور ادب کا لبادہ اوڑھ کر زمانے کو دھوکا دینے والوں سے نفرت کرتے ہیں۔ لاہور آئیں تو مقبول اکیڈمی ضرور تشریف لاتے ہیں اور پھر اپنی باتوں سے جو مجھ عاجز پر فیض رسانی کرتے ہیں۔

جاوید اختر بھٹی عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں میں ان کا احترام بزرگوں کی طرح کرتا ہوں۔ علم و فضل اور دانش اور خرد کے اعتبار سے جاوید اختر بھٹی اپنی مثال آپ ہیں۔

میری سوانح ''سفر جاری ہے'' پر ''ایک مطالعہ'' کے عنوان سے جاوید اختر بھٹی نے جو مقالہ لکھا ہے اس میں آپ بیتی کے فن پر چند بنیادی باتیں بھی پیش کر دی ہیں جنہیں بہت پسند کیا گیا ہے۔

☆☆

جوگندر پال

جوگندر پال بھارت (ہندوستان) کے نامور افسانہ نگار ہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ اس وقت وہ بھارت کے سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں اور انہوں نے اس خلاء کو محسوس نہیں ہونے دیا جو قرۃ العین حیدر جیسی افسانہ نگار کی وفات سے پیدا ہو گیا تھا۔ دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جوگندر پال کی نیشنلٹی ہندوستانی ہے لیکن وہ ذہنی طور پر مستقل طور پر پاکستان کے باشندے ہیں اور ان کی روح میرے آبائی وطن سیالکوٹ میں پھرتی رہتی ہے جہاں وہ 25 دسمبر 1925ء کو پیدا ہوئے اور جس کے ایک بازار میں ان کے پتا جی کی کریانے کی دکان تھی جوگندر پال صاحب دو چار سال کے بعد پاکستان ضرور آتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا زندہ تھے تو ہمیشہ ان کے پاس ٹھہرتے تھے اور کہتے تھے کہ میرا قاری ہندوستان میں نہیں بلکہ پاکستان میں ہے۔ اور میں اپنے قاری کو ملنے آتا ہوں۔ وزیر آغا صاحب ان کے ساتھ کسی مناسب جگہ پر ادبی تقریب کا اہتمام کرتے تو لاہور کے ادیب جوق در جوق شریک ہوتے اور جوگندر پال بھی ان سے مل کر نہ صرف خوش ہوتے بلکہ ان کے سوالات کے جواب بھی دلی مسرت سے دیتے۔ ان ادبی تقریبات سے ہی وہ وقت نکال کر سیالکوٹ جاتے اور اپنے پرانے مکان کو جہاں انہوں نے اپنا بچپن گزارا تھا دیکھتے اور خوش ہوتے کہ اس کے کئی مکینوں نے ان کے گھر کی دیکھ بھال اچھی کی تھی اور اب ان کا استقبال بھی بڑی محبت سے کر رہے تھے۔

جوگندر پال نے پاکستان سے ہندوستان جانے کے بعد زندگی کی صعوبتوں کو دیکھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ آدھی رات کو اٹھ کر گاؤں گاؤں پھر کر دودھ جمع کرتے اور پھر جالندھر شہر میں آکر تقسیم کرتے تھے۔ اس دوران انہوں نے قسمت آزمائی کے لئے جنوبی افریقہ جانے کا فیصلہ کیا۔ مرے کالج سیالکوٹ سے لی ہوئی بی اے کی ڈگری ان کے کام آئی اور انہیں 1949ء میں سکول ماسٹری کی نوکری نیروبی میں مل گئی۔ 1955ء میں تعطیل پر دلی آئے تو دو تین ماہ سر توڑ کوشش کر کے ایم اے کا امتحان پنجاب یونیورسٹی (مشرقی پنجاب) سے پاس کر لیا۔ 1964ء میں پنشن لے کر دہلی آ گئے اور یہیں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔

جوگندر پال کو افسانہ لکھنے کا جوہر قدرت نے عطا کیا تھا۔ وہ زندگی کو افسانہ نگار کی نظر سے دیکھتے اور معمولی سا واقعہ بھی ان کے دل پر اثر انداز ہوتا تو وہ اس تجربے میں دوسرے لوگوں کو شریک کرنے کے لئے افسانہ لکھ ڈالتے۔ ان کے اندر سے افسانہ نگاری کا جوہر کالوں کے دیس افریقہ میں جا کر نکلا۔ ان کے ابتدائی افسانے افریقی پس منظر میں ہی لکھے گئے ہیں۔ یہ افسانے اردو کے رسائل میں چھپے تو ان کی داد کرشن چندر نے دی۔ جوگندر پال نے 1964ء میں نیروبی سکول سے پنشن لے لی اور واپس ہندوستان میں آ گئے۔ اورنگ آباد میں ایلورا اور اجنتا کے غار دیکھنے گئے تو وہیں انہیں ایس بی کالج اورنگ آباد میں پرنسپل کی ''جاب'' مل گئی جسے انہوں نے فوراً قبول کر لیا لیکن پال صاحب یہاں بھی زیادہ عرصہ تک نہ ٹھہرے اور 1976 میں پوسٹ گریجوایٹ کالج کے پرنسپل سے استعفیٰ دے کر دہلی آ گئے۔ منداکنی انکلیوز میں اپنا گھر بنایا اور یہیں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ دراصل وہ چاہتے تھے کہ ایک ''کل وقتی'' ادیب کی حیثیت میں کام کریں۔ دنیا کو دیکھیں، دنیا والوں کو پرکھیں اور افسانے لکھیں۔ ایک اور بات جو انہوں نے بتائی یہ تھی کہ ان کی بیگم صاحبہ محترمہ کرشنا پال نے بھی انگریزی میں ایم اے کیا تھا اور وہ ہندی میں افسانے لکھتی تھیں ان کی بیٹی سکریتا پال نے بھی ایم اے انگریزی میں ہی کیا۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی اور افسانے کے موضوع پر متعدد کتابیں لکھیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے کی شادی اردو کے نامور شاعر اور ادیب بلراج کومل کی

بیٹی سے کی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جوگندر پال کا سارا گھرانہ ادب دوستوں کا ہے۔

جوگندر پال سے میرا پہلا تعارف ڈاکٹر انور سدید نے کرایا تھا۔ پال صاحب نے انہیں دنوں ایک ناول ''خواب رو'' لکھا تھا جس کا ایک باب انہوں نے ایم اے او کالج لاہور کی ادبی تقریب میں پڑھا جس کی صدارت ڈاکٹر وزیر آغا کر رہے تھے۔ اس ناول میں ''مہاجریت'' کو موضوع بنایا گیا تھا۔ یہ ایک ایسے کنبے کی کہانی تھی جو لکھنو سے کراچی میں آباد ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے کردار کراچی میں زندگی گزارنے کے باوجود ذہنی طور پر لکھنو میں ہی رہائش پذیر تھے۔ دلچسپ بات یہ بتائی گئی کہ جوگندر پال نے بھی نئی دہلی میں اپنا سیالکوٹ آباد کر رکھا ہے اور پاکستان سے جو ادیب بھی دہلی جاتا ہے وہ بالعموم ان کے دہلی میں سیالکوٹ والے گھر میں ہی ٹھہرتا ہے۔ میری ملاقات جوگندر پال کے ساتھ اس کے ناول ''خواب رو'' کے سلسلے میں ہی ہوئی تھی۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کا یہ ناول پاکستان میں پہلے چھپا اور میں نے جوگندر پال کے مختصر قیام کے دوران ہی یہ ناول چھاپ کر انہیں پیش کر دیا تھا۔

جوگندر پال اندرونِ ملک اور بیرون ملک کئی بین الاقوامی سیمیناروں میں شریک ہو چکے ہیں۔ دھرتی کا کال''، ''میں کیوں سوچوں''، ''مٹی کا ادراک''، ''بے محاورہ......لیکن......رسائی......اور ''کھلا'' ان کے افسانوں کے مجموعوں کے نام ہیں۔ مختصر ترین افسانوں کے دو مجموعے ''کتھا نگر'' اور ''سلوٹیں'' ہیں۔ ان کا ناول ''نادید'' اندرا گاندھی کی ایمر جنسی پر لکھا گیا ہے۔ ''خواب رو'' پاکستان کی اور ''پارے پرے'' کالے پانی (انڈیمان) کا ناول ہے۔ انسانے کے فن پر ان کی نظر انوکھے انداز میں پڑتی ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔ بھارت میں انہیں کئی ادبی ایوارڈ مل چکے ہیں۔ بلاشبہ جوگندر پال اردو کے عظیم اور منفرد افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں۔

......☆☆......

خرقہ پوش صحافی، آئی یو جرال

جناب آئی، یو جرال کا نام میں نے اخبار ''پاکستان ٹائمز'' میں پڑھا تو سب سے پہلے ان کی تحریر کی کاٹ نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ جرال صاحب پیدائشی صحافی ہیں لیکن وہ خبروں کا تعاقب نہیں کرتے بلکہ ان کی لگن کتابوں سے ہے اور وہ کتاب کے مطالعے کو ہی خبر کی صورت دیتے ہیں۔ یعنی کتاب اردو کی ہو یا انگریزی کی اس پر اظہارِ خیال اپنے تیکھے انداز میں کرتے ہیں جو پڑھنے والوں کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ وہ تنقید بھی ایسے انداز میں کرتے ہیں کہ مصنف بھی ناراض نہیں ہوتا اور پڑھنے والے ان کے لکھے پر یقین کر کے کتاب خریدنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ بہت عرصے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ان کا پورا نام انعام اللہ جرال ہے اور وہ آزاد کشمیر کے مشہور شہر میر پور میں گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں اور اپنی خرقہ پوشی پر مطمئن وشاداں ہیں۔ چنانچہ وہ ان صحافیوں سے بالکل مختلف ہیں جو لاہور، اسلام آباد اور کراچی میں سیاست کی غلام گردشوں میں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اور اپنے لفظوں کی ''سرمایہ کاری'' سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جرال صاحب دیانتدار صحافی ہیں اور لفظ فروشی'' پر کبھی مائل نہیں ہوئے۔

آئی، یو، جرال 25 نومبر 1942ء کو مقبوضہ جموں وکشمیر کے گاؤں چاند دیس

(راجوری) میں پیدا ہوئے لیکن جب کشمیر میں آزادی کی جنگ چھڑی تو اپنے خاندان کے ساتھ جہلم آ گئے۔ اور یہیں پرائمری درجے کی تعلیم حاصل کی لیکن میٹرک 1959ء میں کوٹلی آزاد کشمیر سے کیا۔ ان کا مزاج ابتدا سے ہی صحافت کی طرف تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں آزاد کشمیر کی خبریں راولپنڈی کے اخبارات کو بھیجا کرتے تھے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد انہوں نے صحافت کا باقاعدہ آغاز راولپنڈی کے روزنامہ ''ناقوس'' سے کیا اور اپنے قلم کا لوہا ''اپرنٹس شپ '' کے دوران ہی منوالیا۔ ان کا ارادہ جی سی لاہور میں داخل ہونے کا تھا لیکن مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے یہ خواب ادھورا رہ گیا اور ایم اے او کالج سے بی اے کرنے کے بعد ایم اے جرنلزم کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ ابلاغیات سے 1971ء میں لی۔ اور پھر انگریزی جرنلزم میں باقاعدہ طور پر آ گئے۔ انہوں نے پاکستان ٹائمز لاہور میں 1971ء کے بعد چودہ برس تک اعلیٰ خدمات انجام دیں اور صوبہ سرحد کے علاوہ شمالی علاقہ جات کے ایڈیشن انچارج بھی رہے۔

1982ء سے 1995ء تک انہوں نے ایک سو سے زیادہ کتابوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا اور تبصرے اخبارات میں چھپوائے۔ ان تبصروں کی تنقیدی جہت کو بہت سے ادیبوں نے سراہا اور فرمائش کرتے کہ ان کی کتاب پر صرف جرال صاحب تبصرہ کریں۔ یہ تبصرے کتابی صورت میں مرتب ہو چکے ہیں اور بہت جلد اشاعت کی منزل بھی طے کر لیں گے۔

جرال صاحب نے اپنے صحافتی تجربے کا ایک رخ انگریزی ماہنامہ ''دی ایکسپریشن'' میں بھی ظاہر کیا۔ اس میں پاکستانی ادب کی تمام اصناف کے تخلیقی ادب پاروں کی اشاعت کی جاتی تھی اور یہ یونیسکو ئی چھ زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ دو یادگار شماروں کے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا۔ جبکہ یونیسکو کے پاکستانی چیئر کے سربراہ افتخار عارف نے انہیں یقین دلایا تھا کہ اگر ''دی ایکسپریشن'' چار شمارے شائع کرے تو اسے یونیسکو کی گرانٹ دلا دی جائے گی۔ لیکن جرال صاحب کی خوددار کیفیت

نے افتخار عارف صاحب کی اس پیشکش کو قبول نہ کیا۔ اور زاہد ملک صاحب کے انگریزی اخبار ''دی آبزرور'' میں اپنے تجزیاتی مطالعے چھاپنے لگے۔

آئی، یو، جرال صاحب شاعر بھی ہیں اپنی ماں بولی پنجابی میں انہوں نے ایک طویل نظم ''لہو دی شہادت'' لکھی اور اسے کتابی صورت میں شائع کیا۔ مزید برآں انہوں نے دنیا کی سو بہترین کتب میں سے دو کے ترجمے اردو میں ''عوام کی بغاوت'' اور ''افلاس وترقی'' کے نام سے شائع کیے جنہیں اعلیٰ قومی حلقوں میں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔ جرال صاحب نے ایک ''راجپوت ڈائرکٹری'' بھی شائع کی ہے۔ اور حال ہی میں چن دلیس راخوری دے پنج گواچے شاعراں دی کلیات ''گواچے'' کے نام سے شائع کی ہے جسے بہت پسند کیا گیا ہے۔

آئی، یو جرال صاحب سے میرا رابطہ ان کی ''کتاب دوستی'' کے وسیلے سے ہوا۔ ان کی پوری شخصیت ان کی خرقہ پوشی میں پنہاں ہے۔ وہ سادہ لباس میں آئیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ علم ودانش کا دریا بہتا ہوا آپ کے پاس آگیا ہے۔ ان کی زبان میں بلا کی مہکاس ہے۔ ان کا لہجہ بے حد رسیلا ہے۔ وہ انسان سے اس لیے محبت کرتے ہیں کہ خدا نے اسے اشرف المخلوقات پیدا کیا ہے اور ملال کرتے ہیں کہ دنیا داری کے جھمیلوں نے اس انسان سے شرافت چھین لی ہے۔ ایک دن ملاقات ہوئی تو بڑی سادگی سے اپنی آخری آرزو بیان کرنے لگے کہ مجھے آخری سفر پر روانہ کرتے وقت اخبار کے سفید کاغذ پر لپیٹ کر لحد میں اتارا جائے۔ میں حیران ہوا کہ ابھی تو جرال صاحب کے زندہ رہنے اور کام کرنے کے دن ہیں اور وہ ابھی سے مایوسی کی باتیں کر رہے ہیں۔ ہنس کر کہنے لگے کہ میں نے آخری آرزو بیان کی ہے اور آپ کو اپنا گواہ بنایا ہے۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ

''موت کا ایک دن معین ہے''

غالبؔ کو اس دن کا خیال آتا تو اس کی نیند اڑ جاتی تھی۔ اور مجھے اس آخری دن کا خیال آتا ہے تو میں لمبی تان کر سو جاتا ہوں۔ ہاں دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اگلی صبح

نصیب بھی ہوگی یا نہیں۔ لیکن اٹھتا ہوں تو سب سے پہلے سجدۂ شکر بجالاتا ہوں کہ اس خرقہ پوش کو ایک دن کی زندگی اور مل گئی ہے اور یہ سلسلہ اب تک چل رہا ہے۔

رہے نام اللہ کا

............☆☆............

پروفیسر سجاد نقوی

میں پروفیسر سجاد نقوی کو برادرانِ یوسف کے اس دور میں قربانی اور ایثار کی بے مثال شخصیت شمار کرتا ہوں۔ وہ خود اوّل درجے کے ادیب اور انشا پرداز تھے لیکن انہوں نے اپنی زندگی اپنے بڑے بھائی غلام الثقلین نقوی کی ادبی خدمات کے لئے وقف کر دی۔ غلام الثقلین انہیں اپنا چھوٹا بھائی تسلیم کرتے تھے لیکن اپنے افسانوں پر جب تک وہ اپنی رائے نہ دیتے کسی رسالے کو اشاعت کے لئے نہ بھیجتے اور سجاد نقوی بھی اپنی بے لاگ رائے دینے سے کبھی گریز نہ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ غلام الثقلین نقوی کے جتنے افسانے چھپے ہیں سب اوّل درجے کے ہیں اور ان کا ذکر ان کی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں سید احتشام حسین، سید وقار عظیم، رام لال اور ڈاکٹر وزیر آغا نے کیا جو اردو افسانے کے بڑے نقاد ہیں۔ سجاد نقوی 1930ء کی دہائی میں سیالکوٹ کے نواحی گاؤں بھڑتھ میں پیدا ہوئے ان کے والد گرامی سید امیر شاہ نقوی آزادی سے قبل ریاست جموں کشمیر میں پٹواری تھے لیکن بہت جلد انہیں احساس ہو گیا کہ ایک نجیب السادات سید کے لئے پٹوار کا محکمہ بالکل غیر موزوں ہے چنانچہ انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ کہتے ہیں کہ ان کے افسر نے انہیں بہت سمجھایا کہ آمدنی والی یہ نوکری نہ چھوڑیں۔ اس وقت ان کا بڑا بیٹا ثقلین پیدا ہوا تھا اور وہ اس کی پرورش رزق حلال پر کرنا چاہتے تھے۔

چنانچہ انہوں نے افسر کو اپنا فیصلہ سنا دیا کہ وہ نوکری ہی نہیں چھوڑ رہے بلکہ ظالم ڈوگرا مہاراجہ کے کشمیر کو بھی خیر باد کہہ رہے ہیں اور پھر سیالکوٹ کی نواحی بستی بھڑتھ آ گئے جہاں انہوں نے ایک سکول میں درس و تدریس کا نیک کام شروع کر دیا۔ حرام کی دولت کو ٹھوکر مارنے کا رویہ سید امیر شاہ نقوی نے اپنی اولاد کو بھی منتقل کیا۔ ثقلین نقوی کے علاوہ سجاد نقوی اور جواد نقوی نے بھی محکمہ تعلیم میں ہی زندگی گزاری اور ریٹائرمنٹ لی۔

سجاد نقوی نے اپنی زندگی خود بنائی ہے یہ صفت انہیں اپنے بڑے بھائی ثقلین نقوی سے ملی تھی۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ان کے والد کالج کی تعلیم کا خرچ نہیں اٹھا سکتے تو ایف اے کرنے کے بعد مرے کالج چھوڑ دیا تا کہ والد صاحب ان کے چھوٹے بھائی کو تعلیم دلا سکیں۔ سجاد نقوی نے بھی بی اے کرنے کے بعد لائبریری سائنس میں ڈپلومہ لیا اور کتابوں کی دنیا میں آ گئے۔ ان کی پہلی نوکری ایک کلرک کی تھی جو انہیں سرگودھا میں ملی۔ اس شہر میں ہی ان کی ملاقات ڈاکٹر وزیر آغا، انور سدید، غلام جیلانی اصغر اور ڈاکٹر خورشید رضوی سے ہوئی اور پھر انہوں نے سرگودھا کو ہی اپنا وطن بنا لیا۔ شاہینوں کے اس شہر سے ہی ریٹائر ہوئے لیکن جب ان کے اپنے بچے عملی زندگی میں داخل ہونے کے بعد مختلف شہروں میں بکھر گئے تو سجاد نقوی بھی لاہور آ گئے۔ اس وقت وہ اپنی سوانح ''کچھ دیر پہلے نیند سے'' لکھ چکے تھے جس کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ سجاد نقوی نے اپنی اس کہانی میں زیب داستان کے لئے کچھ بڑھا کر پیش کرنے سے اجتناب کیا ہے۔ البتہ جو کچھ ان پر بیتا ہے انہوں نے بلا کم و کاست لکھ دیا ہے۔ میں نے یہ آپ بیتی پڑھی تو محسوس کیا کہ سجاد نقوی نے اپنے باطن سے ''ناول'' برآمد کیا ہے، لیکن اس ناول میں سچ اور صرف سچ شامل ہے اور سجاد نقوی اپنی ذات کو بے نقاب اور معاشرے کو منکشف کر رہے ہیں۔ اب یہ آپ بیتی ہی ان کے بارے میں معلومات کا ماخذ ہے۔

سجاد نقوی کی ادب سے وابستگی موروثی ہے ان کے والد سید امیر شاہ نقوی کو کتاب پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ کرشن چندر ان کے پسندیدہ افسانہ نگار تھے۔ بڑے بھائی

ثقلین نقوی نے ملٹری اکاؤنٹس کی نوکری چھوڑ کر محکمہ تعلیم میں ملازمت کی تا کہ فرصت میسر ہو تو وہ افسانہ لکھ سکیں۔ سرگودھا کے قیام کے دوران سجاد نقوی نے رسالہ ''کامران'' کی ادارت میں انور گوئندی کی معاونت کی۔ انور سدید صاحب نے مجھے بتایا کہ ''کامران'' کے اصل ایڈیٹر سجاد نقوی ہی تھے اور انور گوئندی نے اس کے انتظامی امور سنبھال رکھے تھے۔

ان کو ادبی سطح پر ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی پروان چڑھایا وہ ''ادبی دنیا'' کے شریک مدیر مقرر ہوئے تو سجاد نقوی سے مشورہ کرتے تھے پھر 1966ء میں ''اوراق'' جاری کیا تو انہیں روز اوّل سے اس رسالے کے ساتھ منسلک کر لیا لیکن ان کا نام ''اوراق'' کے سرورق پر اس وقت چھپا جب عارف عبدالمتین کو ترقی پسند ادیبوں نے طعنے دے دے کر ''اوراق'' سے علیحدہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ سجاد نقوی نے ابتداء میں افسانے بھی لکھے تھے لیکن ''اوراق'' میں وہ نقاد بن کر نمودار ہوئے۔ جدید نظموں کے تجزیاتی مطالعوں میں بھی ان کا ذوق نئے زاویے دریافت کرتا۔ ان کے مقالات کی کتاب ''مطالعے'' کے نام سے چھپ چکی ہے۔

سجاد نقوی سے میرا پہلا تعارف ان کے بڑے بھائی غلام الثقلین نقوی نے کرایا تھا۔ میرا ادارہ مقبول اکیڈمی ان دنوں نقوی صاحب کے افسانوں کی کتاب ''سرگوشی'' چھاپ رہا تھا۔ سجاد نقوی اس کتاب کے اشاعتی امور طے کرنے کے لئے ہی مقبول اکیڈمی پر تشریف لائے تھے۔ میں نے دیکھا کہ دونوں بھائی شرافت کا اعلیٰ نمونہ تھے اور دوسرے مصنفین کے مقابلے میں کاروباری امور میں بہت کم دلچسپی لیتے تھے۔ ان کی خواہش صرف یہ تھی کہ ان کی کتاب ''سرگوشی'' کی طباعت خوبصورت ہو۔ متن غلطیوں سے پاک ہو۔ اور اس کی اشاعت وسیع پیمانے پر ہو۔ میں نے یہ کتاب چھاپ کر ان کی خواہشات کی تکمیل کرنے کی پوری کوشش کی۔ اور وہ اتنے خوش ہوئے کہ اپنا سفر نامہ ''چل بابا اگلے شہر'' کے حقوق اشاعت بھی مقبول اکیڈمی کو دے دیئے۔ ان کتابوں پر تبصرے چھپے تو سجاد نقوی صاحب مجھے ان کی فوٹو کاپیاں سرگودھا سے بھیجتے تھے یوں ان

سے تعلقات کی نوعیت برادرانہ ہوگئی۔ میری کتاب ''سفر جاری ہے'' پرانہوں نے ایک خوبصورت مضمون لکھا تھا۔ میں جب بھی یہ مضمون پڑھتا ہوں تو سجاد نقوی کی ادب شناسی کو داد دیتا ہوں۔ بلاشبہ وہ اگلے زمانوں کی شرافت کا نمونہ ہیں۔

☆☆

سرفراز سیّد

سرفراز سیّد کو مجلسی انسان شمار کرتا ہوں۔ وجہ یہ کہ لاہور میں کسی جگہ کوئی ادبی محفل ہو۔ موسیقی کی مجلس ہو، کتابوں کی نمائش ہو، پہلوانوں کا میلہ ہو سرفراز سیّد وہاں ضرور موجود ہوتے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ لاہور کی کتنی مقبول شخصیت ہیں کہ ان کے بغیر کوئی محفل مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ دوسری بات یہ کہ سرفراز سیّد سے اپنی شاعری سنانے کی درخواست کی جائے تو بالکل انکار نہیں کرتے اور سامعین کی درخواست کو شرفِ پذیرائی ضرور بخشتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف ان کا یہ مزاج بھی ہے کہ خود کبھی کچھ سنانے کی درخواست نہیں کرتے اور جب تک دعوت نامہ نہ ملے کسی تقریب میں شریک نہیں ہوتے۔

سرفراز سیّد کو قلم و قرطاس سے پیار ہے۔ کہنے لگے کہ میں نے صحافت کو قلم و قرطاس کی محبت کے تحت ہی اختیار کیا تھا۔ ان کی پیدائش آزادی سے چند سال قبل پٹھان کوٹ میں ہوئی تھی۔ ان کے والد صاحب کا انتقال ان کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ اس لئے پرورش کا سارا بوجھ ان کی والدہ محترمہ نے اٹھایا۔ انہیں اپنے بچپن کے واقعات میں سے 1947ء کی تقسیم کا واقعہ یاد ہے۔ انہیں اپنا پٹھان کوٹ اچانک چھوڑنا پڑا تھا۔ گورداسپور کا ضلع غیر متوقع طور پر ہندوستان میں شامل کر دیا گیا تھا۔ اور ہندو سکھ

بلوائیوں نے مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا تھا۔ سرفراز سید کے چند قریبی رشتہ داروں کو بھی ان کی آنکھوں کے سامنے شہید کر دیا گیا۔ ان کی والدہ اپنے بچوں کو قافلے کے ساتھ لے کر کسی طرح بچ گئیں اور دریا کی دوسری طرف شکر گڑھ پہنچ گئیں۔ سرفراز سید نے یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان نارووال سے پاس کیا بی اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا۔ ان کو ادب کا شوق تھا۔ کتابیں پڑھتے تھے اور ان کی عبارت یاد کر لیتے تھے۔ یہیں شاعری کا شوق بھی لگ گیا۔ ان کے پالن ہار انہیں انجینئر بنانا چاہتے تھے لیکن سرفراز سید کو سائنس کے مضامین اچھے نہیں لگتے۔ چنانچہ ایم اے اُردو میں کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی صحافت میں آ گئے۔

اس زمانے میں اخبار ''مشرق'' کو بہت شہرت حاصل تھی۔ سرفراز سید نے 1966ء میں اس اخبار کے ساتھ تعلق پیدا کیا تو اس کے ساتھ ربع صدی تک نسبت قائم رکھی۔ ادب کے ذوق کی وجہ سے انہوں نے ''مشرق'' کے ادبی صفحے کو سنوارا۔ اس میں اپنی تخلیق کاری کے جوہر دکھانے لگے۔ مجھے یاد ہے کہ ''مشرق'' کا ادبی صفحہ ان دنوں سب سے زیادہ پڑھا جاتا تھا۔ اور اس میں ملک کے تمام نامور ادیب اور شاعر چھپنا اعزاز سمجھتے تھے۔ ''مشرق'' میں ہی سرفراز سید نے اپنے کالم ''راوی نامہ'' کا سلسلہ شروع کیا جو ان کے نام کے ساتھ مستقل طور پر منتھی ہو گیا۔ سرفراز سید، راوی نامہ اور ''مشرق'' ایک اتحاد تلاثہ تھا جس کے تصور میں یہ تین ضلعے شامل تھے۔ اس اخبار کے ہر ڈیسک پر سرفراز سیّد نے کام کیا ہے۔ چنانچہ ان کا صحافت کا تجربہ ہمہ گیر اور متنوع ہے۔ اسی اخبار نے ہی سرفراز سید کو انسان شناسی کی طرف مائل کیا۔ وہ کسی بڑی شخصیت کا انٹرویو کرنے جاتے تو اس کے اندر چھپی ہوئی تمام حقیقتیں کھود کر لے آتے۔ ان کی خوبی یہ تھی کہ انٹرویو چھاپتے تو شخصیت کا احترام ملحوظ رکھتے اور کوئی ایسی بات نہ لکھتے جسے اس شخصیت کی طبیعت ناگوار محسوس کرے۔ گویا انہیں کڑوی گولی کو بھی شکر میں لپیٹ کر پیش کرنے کا فن آتا تھا۔

اخبار ''مشرق'' کی بساط لپیٹ دی گئی تو سرفراز سید کو ''نوائے وقت'' جیسے

نظریاتی اخبار نے ہاتھوں ہاتھ لیا، اور ان کی خدمات سے ''ندائے ملت'' میں استفادہ کیا۔ کچھ عرصے کے بعد انہیں اخبار ''اوصاف'' کی ادارت کا شرف حاصل ہو گیا۔ اب ہر چند وہ ستر کی دہائی میں داخل ہو گئے ہیں۔ لیکن ان کے قلم کی جولانیاں قائم ہیں اور لکھنا مدام لکھنا ہی ان کی زندگی کا نصب العین ہے۔ میری دعا ہے کہ ان سے میری دوستی سدا قائم رہے۔ اور وہ قلم و قرطاس کی ذمہ داریاں نبھاتے رہیں۔

............☆☆............

سلمٰی اعوان

سلمٰی اعوان کے ساتھ میرا برادری کا رشتہ ہے۔ لیکن میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ برادری کے اس خواہری رشتے پر ادب کا بے لوث رشتہ غالب آگیا ہے۔ ہماری وسیع برادری کے ہجوم میں وہ گم شدہ متاع گراں مایہ تھیں اور میں ان سے متعارف بھی نہیں تھا۔ وہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ڈھاکہ گئیں اور تجربات کی ایک دنیا اور ڈگری لے کر جون 1960ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے واپس آئیں تو انہوں نے اپنے مشاہدات کو کاغذ پر اتارنا شروع کر دیا جن کا فنی روپ ناول ''تنہا'' کی صورت میں ظاہر ہوا۔ تب ان کی برادری کے لوگوں نے سلمٰی کی طرف دیکھا اور حیرت سے کہا۔

''ایسی چنگاری بھی یا رب اپنے گلشن میں تھی''

وجہ یہ کہ مغربی پاکستان کے ادیبوں نے مشرقی پاکستان پر بہت کم لکھا تھا اور یہ اعزاز سلمٰی اعوان کے حصے میں آیا کہ انہوں نے مشرقی پاکستان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کے علاوہ سیاسی حالات کا تجزیہ اس ناول میں کر دیا۔ سلمٰی اعوان سے میرا پہلا تعارف اس ناول سے ہی ہوا تھا لیکن اپنی برادری کا فرد ہونے کے باوجود اجنبیت کا احساس ہوا اس احساس کو ان کی ادبیّت نے ختم کیا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ ان کے اس پہلے ناول پر جناب احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، انور سدید، بشریٰ رحمان، فرخندہ لودھی،

سائرہ ہاشمی، صدیق سالک، الطاف حسن قریشی، اسرار زیدی جیسے نامور ادیبوں نے تبصرے لکھے اور اس کتاب کی رونمائی لاہور کے بڑے ہوٹل میں ہوئی۔ سلمیٰ اعوان کو ملک کی نامور ناول نویس خواتین میں بلند مقام دے دیا گیا۔ میں اسے سلمیٰ اعوان کا فطری انکسار سمجھتا ہوں کہ وہ شہرت کی چاندنی میں ادب کا لمبا سفر کرنے کے باوجود ایک متوازن اور سلیقہ مند خاتون ہیں۔ انکساری اور فروتنی ان کی فطرت میں شامل ہے۔ لیکن جس وقت ان کے اندر سے استانی نکل آئے تو وہ معمولی سی بات پر بھی ڈانٹ پلانے سے گریز نہیں کرتیں اور یہ بھی نہیں دیکھتیں کہ سامنے کون ہے؟ میں نے کئی مرتبہ ان کی اس غیر معمولی عادت پر سوچا ہے۔ اور محسوس کیا ہے کہ ان کے مزاج کی یہ جلالی کیفیت شاید ناشروں نے پیدا کی ہے جنہوں نے ان کا ناول 'تنہا'' چھاپتے وقت انہیں ''چک پھیریاں'' دیں۔ سلمیٰ اعوان نے لکھا ہے۔

''......صاحب نے مسودہ میرے ہاتھوں میں واپس پکڑاتے ہوئے کہا

''بی بی! جیل جانے کا میرا ارادہ نہیں ہے''۔

سلمیٰ اعوان یہ سن کر ہنسی لیکن اپنی جلالی طبیعت کے تحت کہا

''چلیئے۔ جیل مجھے بھجوا دیں''۔

''جناب...... مجھے اس سردار جی کی مانند نظر آئے تھے جس کے ہاتھ میں کرپان ہو اور اس نے ایک ہی دار میں حاملہ ماں کے پیٹ سے اس کے بچے کو نکال کر تلوار کی سان پر چڑھا دیا ہو۔''

سلمیٰ اعوان کا یہ مزاج شاید مشرقی پاکستان میں بنا تھا جو اس کتاب کے چھپنے تک ''بنگلہ دیش'' بن چکا تھا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مشرقی پاکستان سے تعلیم حاصل کر کے سلمیٰ اعوان واپس لاہور آئیں تو انہوں نے اپنا سکول بنا لیا اور قوم کے بچوں کو سچ بولنے، سچ کہنے اور سچ لکھنے کی تعلیم دینے لگیں۔ اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک ''گریٹ مدر'' کا کردار بھی ادا کیا جو اپنی کوکھ سے پیدا ہونے والے بچوں کی ہی نہیں، اپنے سکول کے سارے بلکہ پوری قوم کے بچوں کی ماں تھیں۔ میں سلمیٰ اعوان کو اس روپ میں دیکھتا ہوں تو فخر محسوس کرتا

ہوں۔ مشرقی پاکستان کے تعلیمی سفر نے سلمٰی اعوان کو فطرت کے مشاہدے کی ترغیب دی۔ انہوں نے انسانی فطرت کو اپنے افسانوں اور ناولوں میں پوری صداقت سے پیش کیا اور ترکی، روس، اور مصر کا سفر کیا تو واپس آ کر سفر نامے لکھے۔ اندرون ملک ان کا پسندیدہ خطہ شمال علاقہ جات ہیں۔ جن کی سیاحت کا ثمر ان کا سفرنامہ ''میرا گلگت دہنزہ'' ہے جو مقبول اکیڈمی نے پورے اہتمام سے شائع کیا۔ ان کا ناول ''پھول نہ ہوں پامال'' بھی مقبول اکیڈمی سے ہی چھپ کر مقبول ہوا ہے ''تنہا'' کا ایک ایڈیشن بھی مقبول اکیڈمی نے ہی شائع کیا اور اب وہ ہمارے ادارے کی ایسی نامور مصنفہ ہیں جن کے بارے میں دور دراز کے لوگ پوچھتے ہیں کہ ان کی نئی کتاب کب شائع ہو گی؟۔

سلمٰی اعوان سے میں نے ایک دن پوچھا؟

''آپ کو معاشرے کی کون سی حیثیت پسند ہے۔ ایک اعلیٰ پائے کی تعلیمی درس گاہ کے سربراہ کی حیثیت یا ایک ادیب کی حیثیت؟''

سلمٰی اعوان نے بلاتوقف جواب دیا۔ ''مجھے اپنی دونوں حیثیتیں پسند ہیں۔ اور میں دونوں کے مقام اور مرتبے کو پہچانتی ہوں۔ تعلیمی ماہر کی حیثیت میں قوم کے بچوں کو سنوارنے میں جو خوشی حاصل ہوتی ہے؟ وہ اجتماعی نوعیت کی ہے۔ لیکن ادب کی تخلیق کا سواد ہی وکھرا ہے۔''

میری دعا ہے کہ سلمٰی اعوان دونوں کام اپنی بہترین صلاحیتوں سے انجام دیتی رہیں۔ تعلیمی ادارے کے ذریعے وہ ''حال'' کو فتح کر رہی ہیں لیکن ان کے ناولوں اور افسانوں میں جو معاشرہ موجود ہے وہ مستقبل کی طرف بھی سفر کرے گا۔ اور ان کو آنے والے زمانے میں بھی زندہ رکھے گا۔ میری پرخلوص دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

☆☆
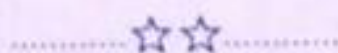
شاہد بخاری

شاہد بخاری سے مقبول اکیڈمی میں پہلی ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں کسی انشورنس کمپنی کا ایجنٹ سمجھا۔ ان کے ساتھ یہ نشست طویل سے طویل تر ہوتی گئی اور بے شمار موضوعات پر گفتگو کرنے کے بعد شاہد بخاری تازہ دم نظر آئے تو پھر بھی میں نے یہی سمجھا کہ وہ آخر میں اپنی انشورنس کمپنی کی بیمہ پالیسی فروخت کرنے کی بات کریں گے۔ لیکن اٹھنے لگے تو انہوں نے ''ادب لطیف'' کا تازہ پرچہ پیش کیا اور اجازت چاہی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ شاہد بخاری ''ادب لطیف'' کے ساتھ وابستہ ہیں جس کی ایڈیٹر چودھری برکت علی کی لائق اور ذہین صاحبزادی صدیقہ بیگم ہیں۔ اس پہلی ملاقات کے بعد شاہد بخاری مجھے ادیب نظر آنے لگے اور وہ جب کبھی مقبول اکیڈمی پر تشریف لاتے مجھے ادبی معاشرے کی تازہ خبروں سے ضرور آگاہ کرتے۔

شاہد بخاری کی شخصیت میں ایثار اور قربانی کے عناصر اللہ تعالیٰ نے وافر مقدار میں شامل کئے ہیں۔ وہ اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کی مدد پر فوراً آمادہ ہو جاتے ہیں۔ میں یہاں ایک واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں جس کا میں عینی شاہد ہوں۔ مقبول اکیڈمی کے کرم فرما اسرار زیدی کراچی کے رسالہ ''اخبار جہاں'' میں ہفتہ وار ادبی ڈائری لکھا کرتے تھے۔ وہ لاہور کی ادبی تقریبات کی خبریں ٹی ہاؤس سے حاصل کرتے تھے۔ جہاں ان کی نشست

زیریں منزل کے ایک کونے میں لگی رہتی تھی اور ادبی خبریں ہر طرف سے ان پر امنڈتی چلی آتی تھیں۔ لیکن پھرٹی ہاؤس بند ہو گیا اور اسرار زیدی صاحب بھی بیمار پڑ گئے۔ اس نازک موقع پر شاہد بخاری آگے آئے اور شہر کی خبریں انہیں بتانے لگے۔ ایک دن اسرار زیدی نے انہیں روک دیا اور کہا کہ اب ''اخبار جہاں'' میں کالم آپ کے نام سے چھپے گا۔'' لیکن شاہد بخاری نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''زیدی صاحب، ایسا نہ کیجئے۔ میں آپ کی آمدنی کے وسیلے پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ مجھے صرف اپنی خدمت پر مامور رکھیے۔''

لیکن اسرار زیدی صاحب نے اگلا کالم شاہد بخاری کے نام سے بھیجا اور پھر انہیں کے نام سے چھپنے لگا۔ اب راز کی یہ بات کھولنا ضروری ہے کہ اس کالم کا معاوضہ شاہد بخاری کے نام آتا تو وہ چیک اسرار زیدی صاحب کے کھاتے میں جمع کرا دیتے۔ اور اس کا ذکر بھی اسرار زیدی سے نہ کرتے کہ کہیں وہ بینک والوں کو بھی چیک وصول نہ کرنے کی ہدایت کر دیں۔

اظہر جاوید صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ شاہد بخاری یہ خدمت صرف اسرار زیدی کے لئے ہی نہیں کرتے تھے بلکہ جب اشفاق نقوی علیل ہو گئے اور ادبی محفلوں میں حاضر ہونے کے قابل نہ رہے تو ان کو ادبی ڈائری کا مواد بھی شاہد بخاری ہی فراہم کرتے تھے اور یہ کالم انگریزی اخبار ''ڈان'' میں چھپتا تھا۔ لیکن کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ معلومات شاہد بخاری نے فراہم کی ہیں۔

شاہد بخاری 18 دسمبر 1949ء کو سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی اور کالج کی تعلیم گورنمنٹ کالج سرگودھا میں حاصل کی۔ ان کے اساتذہ میں پروفیسر غلام جیلانی اصغر، ڈاکٹر خورشید رضوی اور پروفیسر سجاد نقوی شامل تھے۔ شاہد بخاری کہتے ہیں کہ ان اساتذہ نے ہی ان کا رخ ادب کی طرف موڑا اور اعلیٰ کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو کتابیں پڑھتے پڑھتے خود بھی لکھنے کا شوق ہو گیا۔ شعر و شاعری کرنے لگے۔ افسانے لکھنے لگے اور تنقید پر بھی دسترس حاصل کر لی۔ اس دور میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نے جو بینائی سے محروم تھے۔ سرگودھا کے نوجوانوں کو ادبی تربیت دینے کا

سلسلہ شروع کر رکھا تھا اور بزم ''فکر و خیال'' بنا رکھی تھی جس کے اجلاس باقاعدگی سے ہر ماہ ہوتے تھے۔ شاہد بخاری کا تعارف شیخ محمد اقبال سے کالج کے زمانے سے ہو چکا تھا اور وہ ان کی محنت و مشقت اور ایثار کے جذبے سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ وہ بزم ''فکر و خیال'' میں حصہ لینے کے علاوہ شیخ صاحب کے رسالہ ''سفید چھڑی'' میں بھی ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔ یہیں سے انہیں ادبی صحافت میں شرکت اور تجربہ حاصل کرنے کا موقع ملا۔

شاہد بخاری نے ایل ایل بی کر رکھا ہے۔ لیکن وکالت کے مقابلے میں وہ ادبی مصروفیات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ سرگودھا سے لاہور منتقل ہوئے تو گویا وہ ادب کے تالاب سے ادب کے سمندر میں آ گئے۔ اور اب لاہور کے تمام ادبی حلقوں میں گھومنے پھرنے لگے۔ اوپر میں نے اسرار زیدی اور اشفاق نقوی صاحب کے ساتھ ان کی معاونت کا جو ذکر کیا ہے وہ اسی دور میں پیدا ہوئی اور صدیقہ بیگم نے بھی ان کی حوصلہ افزائی کی اور ''ادب لطیف'' کے انتظامی امور میں شامل کر لیا۔ آپ حیران ہوں گے کہ کوہسار ''مری'' ایک ادبی رسالہ ''دستک'' کی ادارت بھی وہ لاہور سے ہی کرتے ہیں۔ اور اسرار زیدی کی وفات کے بعد ''اخبار جہاں'' کی ادبی ڈائری بھی ہر ہفتے لکھتے ہیں۔

شاہد بخاری کی سماجی اور تہذیبی سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے دنیا کی آسان ترین زبان ''اسپرانتو'' میں دلچسپی لینی شروع کی تو جناب علامہ منظر عباسی نے یونیورسل اسلامی اسپرانتو ایسوسی ایشن کا صدر مقرر کر دیا۔ اور اس طرح ان کی خدمات کا دائرہ وسیع کر دیا۔ شاہد بخاری یہ خدمات علامہ صاحب کی وفات کے بعد بھی بڑی تندہی سے انجام دے رہے ہیں۔ سرگودھا میں انہوں نے ''تھنکرز فورم'' کے جنرل سیکرٹری کی خدمات 1996ء سے لے کر 2010ء تک انجام دیں۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے ممبر ہیں۔ ہیومن ڈویلپمنٹ فورم کو اپنی خدمات بلا معاوضہ پیش کر رکھی ہیں۔ ''بزم ہم نفساں'' کی رکنیت بھی انہیں حاصل ہے۔ واضح رہے کہ وہ روٹری انٹرنیشنل کے بھی ''پریذیڈنٹ'' رہ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ لاہور سے ایک ایف ایم نیوز سروس بھی چلا رہے ہیں اور اہم ادبی خبریں

موبائل فون پر تقسیم کرتے ہیں۔ ''تخلیق'' کے ایڈیٹر اظہر جاوید اپنی زندگی میں شاہد بخاری کی بہت تعریف کرتے تھے۔ان کی وفات کے بعد جب اظہر جاوید کے صاحبزادے سونان نے ''تخلیق'' کا اظہر جاوید نمبر جاری کرنے کا اعلان کیا تو شاہد بخاری نے انہیں بھی اپنی خدمات پیش کر دیں...... ان سب باتوں کو پیش نظر رکھیں تو شاہد بخاری اگلے وقتوں کے آدمی نظر آتے ہیں۔ اور اکیسویں صدی کی خودغرض اور مفاد پسند فضا میں ان کا دم غنیمت معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ مجھے ان کی دوستی پر فخر ہے۔میری سوانح حیات ''سفر جاری ہے'' پر شاہد بخاری کا تبصرہ ان کے خلوص کا آئینہ دار ہے۔

............☆☆............

شاہد علی خان

جناب شاہد علی خان کا تعلق برصغیر ہند کے اس علمی و ادبی خاندان سے ہے جس کا ہر فرد ہمہ آفتاب تھا۔ ان کے والد مولانا حامد علی خان نے اپنی نوجوانی میں ادب سے لو لگائی۔ ان کے آئیڈیل ان کے بڑے بھائی مولانا ظفر علی خان تھے جو انگریزی سامراج کی مخالفت اور مسلمانوں کی سیاسی برتری کے لیے اخبار ''زمیندار'' نکالتے تھے۔ حامد علی خان اور ظفر علی خان کے دل میں ادب کی شمع مولانا سراج الدین احمد خان نے جلائی تھی جو شاہد علی خان کے دادا تھے۔ اخبار ''زمیندار'' کی بنیاد بھی انہوں نے ہی رکھی تھی۔ اس خاندان کے ایک اور نامور فرد حمید احمد خان تھے۔ جنہوں نے انگریزی ادب کے استاد کی حیثیت میں ناموری حاصل کی۔ وہ سب اصنافِ ادب پر نظر رکھنے والے ادیب تھے لیکن مطالعہ غالب ان کا خاص موضوع تھا۔ اسلامیہ کالج لاہور سے پروفیسری شروع کی اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت میں ریٹائر ہو گئے۔ تو مجلس ترقی ادب کے ناظم بنائے گئے۔ اردو کے ممتاز مزاح نگار مہدی علی خان جو بعد میں بمبئی جا کر فلمی گانے لکھنے لگے تھے شاہد علی خان کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ اس خاندان کی دو خواتین نے بھی ادب میں بڑا نام پیدا کیا۔ ایک صاحبہ شاعرہ تھیں اور ایک صاحبہ ہمایوں افسانے لکھتی تھیں۔ ان کے ایک افسانے ''سفر کا مقصد'' پر فضلی برادر نے فلم ''نوکر'' بنائی تھی۔

یہ تفصیل میں نے یہ بتانے کے لیے پیش کی ہے کہ شاہد علی خان کی پرورش علم و ادب کے گہوارے میں ہوئی۔ اپنے گاؤں کرم آباد سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لاہور آ گئے اور گریجوایشن ایف سی کالج سے کی۔ اس دور میں ان کا پورا خاندان کرم آباد ضلع گوجرانوالہ سے لاہور منتقل ہو گیا تھا۔ مولانا حامد علی خان آزادی کے بعد ادارہ ''نوائے وقت'' کے لیے رسالہ 'مخزن'' مرتب کرتے تھے۔ اس خدمت سے فارغ ہوئے تو انہوں نے اپنا رسالہ ماہنامہ ''الحمرا'' جاری کر دیا۔ شاہد علی خان اس رسالے میں اپنے والد گرامی کی معاونت کرتے ۔ گویا ان کا بچپن رسالہ ''الحمرا'' کے گہوارے میں پروان چڑھتا رہا۔ انہوں نے نہ صرف الحمراء کے انتظامی امور کی نگہداشت کی بلکہ کاتبوں کے کام کی نگرانی بھی کرتے۔ کتابت پڑھتے اور اس کی غلطیاں لگواتے۔ اس فنی محنت نے ان کے دل میں ادب کی شمع روشن کر دی۔ ادب کی مزید تربیت ان کے والد گرامی مولانا حامد علی خان نے دی۔ اگرچہ شاہد علی خان نے اپنی عملی زندگی کے لیے بنکنگ کا شعبہ منتخب کیا تھا اور انہوں نے 35 برس یونائیٹڈ بنک میں اعلیٰ عہدوں پر کام کیا تھا لیکن ایف سی کالج کے ادبی مجلّہ ''فولیو'' کی ادارت اور پھر رسالہ ''الحمرا'' میں مولانا حامد علی خان کی معاونت نے ان کے دل میں ادارت کا شوق بھی پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ یونائیٹڈ بینک سے ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ادبی صحافت کی طرف آ گئے اور رسالہ ''الحمراء'' جاری کر دیا جو مولانا حامد علی خان کے زندگی میں ہی پانچ سال تک ادب کی تاباں پھیلانے کے بعد بند ہو چکا تھا۔ الحمراء جاری کرنے کا ایک اور مقصد شاہد علی خان کے سامنے یہ بھی تھا کہ وہ اس رسالے کے ذریعے اپنے خاندان کے ادبا کے علاوہ مولانا حامد علی خان کی ایک یادگار قائم کرنا چاہتے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ''نیا ادب'' جسے بعض نوجوان ادبا فروغ دے رہے تھے، بے راہ روی کا شکار تھا۔ شاہد علی خان نے الحمرا جاری کر کے مولانا حامد علی خان کی ادبی ہدایات کی تجدید کی اور موضوعات کے تنوع کے باوجود خالص ادب کی اس روایت کی پرورش کی جس کو مولانا ظفر علی خان، حامد علی خان اور حمید احمد خان نے صحت مند خطوط

پر استوار کیا تھا۔ یہ علمی و ادبی رسالہ 2001ء میں جاری ہوا۔ اس کی کامیابی میں شاہد علی خان صاحب کی رات دن کی محنت شامل ہے اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے الحمراء میں اپنے والد صاحب کی روایات کی ہمیشہ پیروی کی جن کا اجمال حسب ذیل ہے۔

1۔ رسالہ پابندی وقت اور بغیر کسی وقفے کے شائع کرنا۔

2۔ موضوع کے انتخاب کی آزادی دینا لیکن بیان کی شائستگی اور اسلوب کی وضعداری کو قائم رکھنا۔

3۔ مذہبی مباحث سے بالعموم گریز کرنا۔

4۔ پاکستانیت کو فروغ دینا اور علامہ اقبال اور قائداعظم کی تعلیمات کو عام کرنا۔

5۔ خلق خدا کی رہنمائی کے لیے مشاہیر ادب کے بارے میں معلوماتی مضامین شائع کرنا اور یادنگاری کو فروغ دینا۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ گزشتہ بارہ سال کے عرصے میں ان صحت مند خطوط پر شاہد علی خان نے سختی سے عمل کیا ہے۔ اور اب ''الحمراء'' اردو ادب کا سب سے درخشاں رسالہ شمار ہوتا ہے۔ جو کسی گروپ بندی کا قائل نہیں ہے۔ اور جو مختلف نوعیت کے مضامین سے اپنے قارئین کو خیالات کی کئی آکسیجن فراہم کرتا ہے اور ان کے ذوق نظر کی آبیاری کرتا ہے۔ متذکرہ خوبیوں کی بنا پر ہی ''الحمراء'' کی مانگ میں قومی حلقوں کے علاوہ بین الاقوامی حلقوں میں بھی روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور دنیا کے بیشتر اہل قلم الحمراء کے معاونین ہیں۔ گزشتہ دو سال سے الحمراء نے سالنامہ شائع کرنے کی تجدید بھی کی ہے۔ اور مضامین کے لحاظ سے تو الحمراء کا ہر پرچہ خاص نمبر ہوتا ہے۔

مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ اس خاندان سے میرا تعلق مولانا حامد علی خان کے زمانے میں پیدا ہوا۔ مولانا امریکی ادارہ فرینکلن کے ڈائریکٹر تھے اور میں ایک ناشر تھا۔ فرینکلن کی ترجمہ شدہ کتابیں نجی اشاعتی ادارے چھاپتے تھے۔ مولانا حامد علی خان مقبول اکیڈمی کی کتابوں کی پیشکش سے اتنے خوش تھے کہ وہ اس ادارے کو دوسروں پر فوقیت دیتے۔ مقبول اکیڈمی کے متعلق کہا کرتے تھے کہ ایک تو اس کی پیشکش خوبصورت ہوتی

ہے۔ دوسرے اس کے متن میں اغلاط نہیں ہوتیں۔ تیسرے یہ کہ کتابوں کی قیمت بے حد مناسب رکھتا ہے۔ میں ان کے چند خطوط اپنی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' میں شامل کر چکا ہوں۔ یہ خاندان میرا مربی اور محسن ہے اور میری خوشی کا باعث یہ بھی ہے کہ جناب شاہد علی خان نے بھی اس تعلق کو قائم رکھا ہے۔ اور وہ اپنے نامور والد صاحب کی طرح مقبول اکیڈمی اور مجھے اپنی محبت سے سرفراز کرتے ہیں۔

☆☆
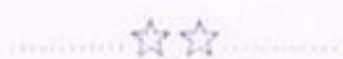
شبہ طراز

شبہ طراز عہد حاضر کی ایک ایسی ادیبہ ہیں جنہیں والد اصغر مہدی کی طرف سے شاعری کا اور والدہ عذا اصغر کی طرف سے افسانے کا ذوق ورثے میں ملا۔ اس ادبی ورثے میں جدیدیت کا پیوند خود شبہ طراز نے لگایا اور اس میں توسیع یوں کی کہ اس میں مصوری کا فن لطیف بھی شامل کر لیا اور ممتاز ادبی رسالہ ''تجدید نو'' کی ادارت بھی سنبھال لی۔ اس لئے اب میں کہہ سکتا ہوں کہ شبہ طراز ایک ادیبہ کا نام نہیں بلکہ ان کی ذات میں کئی فنون لطیفہ جمع ہو گئے ہیں اور اب ان کی انفرادیت ہر فن میں تسلیم کی جا رہی ہے۔ اس کی صورت یوں پیش آئی کہ یہ خاکہ لکھنے کے لئے میں اپنے مہربان دوست اظہر جاوید صاحب کے پاس ان کے دفتر ''تخلیق'' میں گیا اور ان سے پوچھا ''مجھے کچھ شبہ طراز کے بارے میں بتایئے'' چند رسمی نسبتوں کا ذکر کرنے کے بعد انہوں نے اپنا قولِ فیصل دیا کہ شبہ طراز جدید طرزِ فکر کی بہت اچھی شاعرہ ہے۔ اظہر جاوید کے ساتھ صوفے پر ایک خوبصورت خاتون تشریف فرما تھیں۔ وہ فوراً بولیں نہیں جی نہیں۔ شبہ طراز مختصر افسانہ اچھا لکھتی ہے۔ بلکہ بہت اچھی لکھتی ہے۔ اس کے افسانوں کی کتاب بھی چھپ چکی ہے اور میں نے ''تخلیق'' میں اس پر تبصرہ بھی پڑھا ہے۔ مقبول اکیڈمی میں واپس آ کر میں نے ڈاکٹر انور سدید کو فون کیا اور یہی بات ان سے پوچھی۔ وہ بولے ''شبہ طراز کسی ایک فن میں بند نہیں بلکہ آزاد پنچھی کی طرح ہے

وہ کئی فنون کی فضا میں پرواز کر رہی ہیں''۔ میں نے پوچھا ''مثلاً کون کون سے فنون؟'' انور سدید نے جواب دیا ''اس نے ٹیکسٹائل ڈیزائننگ میں ڈپلومہ لے رکھا ہے اور ان ڈیزائنوں کو وہ اپنے رسالہ ''تجدید نو'' کے سرورقوں پر بھی چھاپ رہی ہیں۔ ٹائٹل بنانے والے کئی مصوران سے حسد کرنے لگے ہیں''۔ پھر بولے ''آپ کو معلوم ہے کہ شبہ طراز ہومیو پیتھی کی ماہر ڈاکٹر بھی ہے۔ اصغر مہدی کی وفات کے بعد میرا علاج وہی کر رہی ہے اور میں گھر میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا ہوں''۔

سچی بات یہ ہے کہ اصغر مہدی اور افسانہ، ناول نگار عذرا اصغر کے آنگن میں جب شبہ طراز نام کا ستارہ طلوع ہوا تھا تو انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ یہ لڑکی مطلع ادب کو تابناک بنا دے گی اور اپنی تخلیق کاری کو فنونِ لطیفہ کے کئی گوشوں میں پھیلا دے گی۔

شبہ طراز لاہور میں پیدا ہوئیں لیکن اس وقت ان کے والدین فصیلوں والے لاہور سے باہر ایک کشادہ ماڈرن بستی میں رہتے تھے جس کا کلچر قدیم لاہوری کلچر سے مختلف تھا۔ لیکن لاہور تو لاہور ہے۔ اس کی تہذیبی خوشبو فصیلوں میں بند نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ شبہ طراز نے بھی لاہوری تہذیب کے اثرات قبول کئے اور زندگی کو زندہ دلی سے بسر کرنے کا فیصلہ کیا تو فنونِ لطیفہ میں خصوصی دلچسپی پیدا کی۔ ایم اے اُردو کرنے کے بعد ایچ ایم ایس کا امتحان پاس کیا۔ پھر کمپیوٹر سیکھنے لگی۔ ٹیکسٹائل ڈیزائننگ میں ڈپلومہ حاصل کیا اور شادی ہو گئی تو اس کے فرائض بھی بڑی خوبصورتی سے نبھائے اب وہ ایک وفادار بیوی ہے تو شفیق ماں بھی ہے۔ لیکن اس کی پہلی حیثیت ایک تخلیق کار کی ہے۔ وہ اپنا تخلیق اظہار قلم اور برش سے کرتی ہیں۔ ان کے سامنے زندگی کا وسیع کینوس پھیلا ہوا ہے جس پر وہ نظمیں لکھتی ہیں۔ افسانے تراشتی ہیں اور تصویریں بناتی ہیں۔ غزل شبہ طراز کی محبوب صنف ہے لیکن اس نے نام ہائیکو نگاری میں پیدا کیا اور تین مصرعوں کی صنف ''ماہیا'' کی آبیاری کی۔ اور چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھیں۔ چنانچہ ''جگنو ہنستے ہیں'' میں ہائیکو اور ماہیے پیش کئے۔ ''جھیل جھیل اداسی'' ان کی نظموں کی کتاب ہے۔ افسانے ان کی کتاب ''درد کا لمس'' میں جمع کئے گئے ہیں۔ ان کی عملی زندگی کا

ایک شعبہ تدریس بھی ہے لیکن جب بیٹیوں کی تربیت کا مسئلہ سامنے آیا تو انہوں نے ملازمت ترک کردی اور خانہ داری شروع کردی۔ اپنی بیٹیوں کو کار پر بٹھا کر خود سکول چھوڑنے جاتیں اور چھٹی کے وقت خود واپس لاتیں۔ اب ماشاء اللہ ان کے بچے خود باشعور اور دانشمند ہو گئے ہیں اور اب پھر شبہ طراز نے تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ کہنے لگیں ''نئے تعلیمی اداروں میں ادب کا ذوق پروان نہیں چڑھایا جاتا۔ میں اپنے طالب علموں کے دل میں ادب کی شمع روشن کرتی ہوں''۔

شبہ طراز مجھے اس لئے عزیز ہے کہ وہ عذرا اصغر کی صاحبزادی ہیں اور عذرا کی میں اس لئے عزت کرتا ہوں کہ وہ مقبول اکیڈمی کی ایک باوقار قلم کار ہیں اور ہمیں اپنی کتابوں کے حقوق اشاعت کشادہ دلی سے دیتی رہتی ہیں۔ پچھلے دنوں اصغر مہدی کی وفات نے اس خاندان کو ایک دائمی غم میں مبتلا کر دیا تھا۔ شبہ طراز نے اپنی والدہ عذرا اصغر کو سہارا دیا کہ آپ کے سامنے تاجور عنبر اور شبہ طراز اور ان کے بچے موجود ہیں۔ اور موت تو برحق ہے عذرا کو سن کر سکون آ گیا......

شبہ طراز نے میری آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' پر اپنے رسالہ ''تجدید نو'' میں بہت خوبصورت تبصرہ شائع کیا تھا۔

☆☆
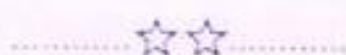
شفیع ہمدم

شفیع ہمدم کو میں ایسا ادیب سمجھتا ہوں جسے کسی بڑے شہر کی ہوا نہیں لگی۔ میں نے ان کی آواز نہ کبھی ریڈیو پر سنی ہے نہ کبھی شکل ٹیلی ویژن پر نظر آئی ہے۔ بلکہ میں نے تو انہیں لاہور میں کسی اخبار کے دفتر کا چکر کاٹتے ہوئے اور ادبی صفحے کے ایڈیٹر کو کیک اور پیسٹریوں کے ساتھ چائے پلاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ لیکن وہ اچھے ادبی رسائل میں ہر جگہ نظر آتے ہیں ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اردو نثر کی بہت سی اصناف میں کام کیا ہے۔ پروفیسر تنویر حسین انہیں اچھا افسانہ نگار کہتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید ان کے انشائیہ نگاری کا لوہا مانتے ہیں۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کہتے ہیں کہ وہ خاکہ نگار ہے۔ میری کتاب ''سفر جاری ہے'' پر شفیع ہمدم نے تبصرہ لکھا تو میں نے ان کا نام اعلیٰ پائے کے تبصرہ نگاروں میں لکھ دیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا اب مرحوم ہو چکے ہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ انہیں شفیع ہمدم سے امید تھی کہ وہ تنقید میں نام پیدا کریں گے۔ ان کے خاکوں اور انشائیوں کی دو کتابیں انعام یافتہ ہیں۔ اور آخر میں یہ بھی بتا دوں کہ شفیع ہمدم شاعری بھی کرتے ہیں۔ ان کی غزل پر انہیں جھنگ کے ادیبوں نے کھل کر داد دی ہے۔

جھنگ کو ہیر کی نگری ہونے کا شرف حاصل ہے۔ لیکن میری نظر میں جھنگ نے بیسویں اور اکیسویں صدی میں ادب کی بہت خدمت کی ہے۔ بیسویں صدی میں اس

دیہاتی شہر سے مجید امجد، شیر افضل جعفری اور رفعت سلطان نے اس شہر کا نام ادب میں بلند کیا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا اردو کے جلیل القدر شاعر عبدالعزیز خالد بھی ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے تو اسی شہر میں ٹھہرے تھے۔ اس شہر کے گورنمنٹ کالج میں ڈاکٹر عبدالسلام (نوبل انعام یافتہ) اور ڈاکٹر وزیر آغا نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اب اس شہر پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے دو نام بالخصوص اہم نظر آتے ہیں ایک ڈاکٹر ناصر عباس نیر اور دوسرا شفیع ہمدم ہے۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ جس کالج میں ڈاکٹر عبدالسلام اور ڈاکٹر وزیر آغا ڈسکوں پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کرتے تھے، اس کالج میں یہ دونوں اصحاب نئی نسل کو تعلیم دیتے رہے ہیں اور اوّل الذکر دو ڈاکٹروں کے علم و حکمت کی خوشبو سے معطر ہو کر پڑھاتے رہے ہیں۔ ان دونوں نے اب جھنگ کو خیر باد کہہ دیا۔ اس کے طلباء انہیں ہر وقت یاد کرتے ہیں۔

شفیع ہمدم 23 جنوری 1945ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت ہندوستان میں دو قومی نظریے کی بنیاد پر تحریک پاکستان شروع ہو چکی تھی۔ اور شفیع ہمدم کی پیدائش کے صرف دو سال بعد پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا تھا۔ اس لحاظ سے انہوں نے ہوش کی آنکھ آزاد ملک پاکستان میں کھولی اور غلامی کے ہندوستان کو نہیں دیکھا۔ تعلیم کا سلسلہ جاری ہوا تو ایم اے تک روانی سے چلتے گئے اور کامیابی کے جھنڈے گاڑتے گئے۔ اس دوران انہیں گورنمنٹ کالج جھنگ میں شعبۂ اردو میں لیکچرار کا عہدہ مل چکا تھا اور یہاں انہوں نے ایسوسی ایٹ پروفیسر تک ترقی حاصل کی اور ایم فل کی ڈگری بھی حاصل کی۔ وہ اپنے کالج کے طلباء کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ علم حاصل کرنے کے جو یا چھوٹے چھوٹے قصبوں میں رہتے ہیں۔ اور استاد کا احترام کرتے ہیں کلاس میں شور نہیں مچاتے۔ نہ یونین بازی کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ استاد کمرہ تعلیم سے خوشی خوشی نکلتا ہے تو تخلیقی کام میں مگن ہو جاتے ہیں۔ شفیع ہمدم فخر سے کہتے ہیں کہ مجھے جھنگ نے ادیب بنایا ہے جہاں ادیب آئے روز ادبی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ بیدل پانی پتی شاعری کی دکان سجاتے تھے۔ جعفر طاہر اور شیر افضل جعفری میں ادبی نوک جھونک ہوتی تھی۔ شفیع ہمدم اب

سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اور فیصل آباد میں مدینہ ٹاؤن میں مقیم ہیں۔
میری ان سے ٹیلی فون پر ملاقات ہوا کرتی ہے۔ پہلا سوال کرتے کہ انور سدید کی نئی کتاب کون سی چھپی ہے؟ گویا شفیع ہمدم اور میرے درمیان انور سدید قدر مشترک ہیں۔ لاہور آتے تو اپنی نئی کتاب مجھے مقبول اکیڈمی پر آ کر دیتے۔ ان کے خاکوں کی دو کتابیں ''دل داستان سلامت'' اور ''حال احوال'' چھپ چکی ہیں۔ ان کے انشائیے رسالہ ''اوراق'' اور ''کاغذی پیرہن'' میں چھپتے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیہ کے معیار پر پورے اترتے تھے۔ اور جب ان کا انشائیہ چھپ جاتا تو پڑھنے والے اس کی تعریف کرتے تھے۔ ان کے پنجابی افسانوں کے دو مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔ ان کے نام ہیں۔ ''چانن'' اور ''تصویر گواچ گئی''...... انشائیوں اور تبصروں کی دو کتابیں زیر طبع ہیں۔
شفیع ہمدم سادہ مزاج اور شریف انسان ہیں انہوں نے جھنگ کی دیہاتی زندگی سے ایسے کرداروں پر افسانے لکھے ہیں جنہیں پڑھ کر بڑے شہروں کے افسانہ نگار بھی اپنی طرف اور کبھی شفیع ہمدم کی طرف دیکھتے ہیں۔ کتابوں پر تبصرے کرنا ان کا شوق ہے لیکن وہ مثبت زاویہ نظر کے ادیب ہیں اور کتاب پر کبھی منفی تبصرہ نہیں لکھتے بلکہ کتاب کی خوبیاں اتنی گنواتے ہیں کہ مصنف خوش ہو جاتا ہے۔ اور اس کی نئی کتاب چھپے تو سب سے پہلے شفیع ہمدم کو تبصرے کے لئے بھیجتا ہے۔ شفیع ہمدم کے ادبی مقام اور مرتبے کا اعتراف ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر ناصر عباس نیر اور حنیف باوا نے بھرپور مضامین لکھ کر کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ ''ایں سعادت بزور بازو نیست''

☆☆
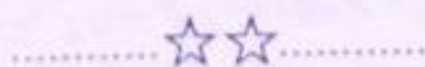
شہزاد منیر احمد

شہزاد منیر احمد کی پیدائش جموں و کشمیر کی جنت نظیر وادی میں 2 مئی 1946ء کو ہوئی۔ اس گاؤں کا نام جگتو چک ہے۔ اگر چہ 1946ء میں تحریک پاکستان زور پکڑ چکی تھی اور کشمیر کی وادی میں بھی ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے گونج رہے تھے لیکن جگتو چک نسبتاً پرامن گاؤں تھا۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس گاؤں میں قائداعظم کا پیغام نہیں پہنچا تھا۔ شہزاد منیر احمد کے والد صاحب جگتو چک کے مسلمانوں کو جمع کرتے اور انہیں تحریک پاکستان کے مقاصد اور درخشاں مستقبل سے آگاہ کرتے چنانچہ یہ کہنا درست ہو گا کہ شہزاد منیر احمد کی رگوں میں ''پاکستان'' کا نام خونِ مادر سے داخل ہو گیا تھا۔ ان کے ہوش سنبھالنے سے پہلے 14 اگست 1947ء کو پاکستان معرض وجود میں آ گیا تو جگتو چک کے مسلمانوں نے ہجرت میں دیر نہ کی۔ چنانچہ شہزاد منیر احمد کا خاندان بھی جموں کے رستے سیالکوٹ آ گیا اور اگوکی میں مستقل قیام کر لیا۔

شہزاد منیر احمد نے سیالکوٹ کی ادبی فضا میں پرورش پائی اور گورنمنٹ ہائی سکول ''اگوکی'' سے میٹرک کا امتحان 1964ء میں امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا۔ اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے پاکستان نیوی میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس ملازمت کے دوران ہی انہوں نے مشرقی پاکستان کی سیاحت بھی کی۔ چار سال کے اس قیام میں انہوں نے مشرقی

پاکستان کے عوام کو بہت قریب سے دیکھا۔ ان کے احساسات وجذبات کا جائزہ لیا اور محسوس کر لیا کہ پاکستان کے اس صوبے کا سیاسی مزاج مغربی پاکستان سے بالکل مختلف ہے۔ شہزاد منیر احمد کہتے ہیں کہ مجھے اس وقت ہی احساس ہو گیا تھا کہ ہندوستان ہمارے اس صوبے میں نفرت کے جذبات کی پرورش کر رہا تھا۔ مشرقی پاکستان کے سماجی اور سیاسی حالات دیکھ کر وہ فکرمند ہو گئے اور اس بات کا اظہار بار بار کرتے کہ مشرقی پاکستان کے لوگ پاکستانی کم اور بنگالی زیادہ ہیں۔ ان کے گھروں میں رابندر ناتھ ٹیگور کی تصویریں آویزاں تھیں اور سر سنگیت کے دوران بنگالی شاعروں کے گیت پڑھے جاتے جن میں ہندوستان کی ثنا خوانی ہوتی۔ شہزاد منیر احمد کہتے ہیں مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میں پاکستان کا شہری ہوں لیکن کسی ہندوستانی شہر میں رہتا ہوں۔ ان کے خیال میں علیحدگی کے بیج آزادی کے ابتدائی برسوں میں بوئے گئے تھے اور پھر دسمبر 1971ء تک ان کی پرورش کی جاتی رہی۔ حتیٰ کہ یہ شاخ ہی ٹوٹ گئی۔

چار سال کے بعد 1969ء میں شہزاد منیر احمد کراچی آ گئے۔ پاکستان نیوی کی ملازمت ترک کر دی۔ کراچی یونیورسٹی سے گریجوایشن کے ساتھ ساتھ قانون کی تعلیم بھی حاصل کرنے لگے۔ اس دوران ہی انہیں پاکستان فضائیہ میں منتخب کر لیا گیا اور وہ ٹریننگ کے لئے اکیڈمی میں چلے گئے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے بہترین 27 برس پی اے ایف کی خدمت میں صرف کئے اور بالآخر 8 مئی 2000 کو وہ انٹر سروسز گروپ میں شامل ہو کر بلوچستان چلے گئے جہاں انہوں نے انٹرنیشنل ریلشنز (بین الاقوامی تعلقات) میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اب پھر ان کی خدمات فضائیہ کالج نے حاصل کر لیں اور انہیں جناح کیمپ راولپنڈی میں وائس پرنسپل کا عہدہ پیش کر دیا۔ یہاں وہ قوم کے نوجوانوں کو وطن عزیز سے محبت کا سبق دیتے اور اپنی دھرتی کے لئے جان قربان کر دینے کے جذبے سے سرفراز کرتے ہیں۔

راولپنڈی میں قیام کے دوران ہی ان کے اندر سے ایک ادیب بھی بیدار ہو گیا۔ اور انہوں نے اپنے مشاہدات اور تجربات کو فکشن میں پیش کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کے ناول ''زندہ آنکھیں مردہ خواب'' پر ملک کے رسائل اور اخبارات میں خوبصورت اور معنی

خیز تبصرے چھپ چکے ہیں۔ شہزاد منیر احمد سے میرا پہلا تعارف علامہ عبدالستار عاصم نے کرایا تھا۔ انہوں نے میری کتاب ''سفر جاری ہے'' پڑھی تھی۔ اس کتاب نے ہی ان کو ملاقات پر اکسایا اور وہ علامہ صاحب کے ساتھ مقبول اکیڈمی پر تشریف لے آئے۔ ان کو دیکھ کر میرے دل میں یہ پہلا احساس پیدا ہوا کہ میں ایک انتہائی تہذیب یافتہ انسان سے مل رہا ہوں جس کی رگ رگ میں قومی درد سمویا ہوا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے ''سفر جاری ہے'' کا نہ صرف مطالعہ کیا تھا بلکہ اس پر ایک مضمون بھی لکھ لائے تھے۔ اور اس میں سوانح عمری کے قاری کے لئے یہ بڑے پتے کی بات کہی تھی:۔

> ''میرے قریب سوانح عمریاں پڑھنے والوں کے لئے اپنے بارے میں فیصلہ کرنے میں بڑی معاون اور مؤثر ثابت ہوتی ہیں۔ یہ ایک ایسا پیمانہ ہے کہ قارئین بغیر کسی ندامت، یا شرمساری کے اور کوئی معاوضہ ادا کئے بغیر اپنی شخصیت میں پنہاں ناپسندیدہ معیار کی اصلاح کرے۔ یا مشکل حالات میں الجھ جانے پر کوئی باوقار حل تلاش کرے کیونکہ سوانح عمری میں شامل کچھ واقعات ایسے ہی ہوتے ہیں جو قابل راہیں تلاش کرنے اور سودمند فیصلہ کرنے میں راہنمائی کرتے ہوئے ملتے ہیں''۔

یہ اقتباس خودنوشت سوانح کے افادی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ اب مجھے کسی بڑے دانشور کا یہ قول یاد آتا ہے کہ ''ہر شخص کی زندگی میں ناول جیسی کہانی موجود ہوتی ہے اور خود نوشت سوانح نگار دراصل اس کہانی کو ہی بیان کرتا ہے۔ جو دوسروں کے لئے سبق آموز ہو سکتی ہے''۔

شہزاد منیر احمد نے اپنی زندگی جن حالات میں گزاری اور پاکستان کے چپے چپے کو جس گہری نظر سے دیکھا ہے اور تجربات و مشاہدات کی جو کائنات سمیٹی ہے۔ اس کو پیش نظر رکھیں تو ان پر لازم آتا ہے کہ اپنی سوانح حیات خود لکھیں اور جو کچھ دیکھا ہے اس میں اپنی قوم کو

بھی شامل کریں۔ ان کے ناول ''زندہ آنکھیں مردہ خواب'' میں ان کی دردمندی کا زاویہ موجود ہے۔ لیکن جب وہ اپنی زندگی کے واقعات منکشف کریں گے تو یہ خیالی ناول سے زیادہ اثر انگیز ہوں گے۔ شہزاد منیر احمد نے اپنے خوبصورت تبصرے میں میری خودنوشت ''سفر جاری ہے'' کو ایک غیر معمولی ادبی دستاویز قرار دیا ہے۔

میں علامہ عبدالستار عاصم کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے میری ملاقات اس دور کے ایک بہترین انسان سے کرائی۔ اس پہلی ملاقات کے بعد وہ جب کبھی لاہور آتے تو مقبول اکیڈمی پر ضرور تشریف لاتے اور میں ان کو دیکھتے ہی دل ہی دل میں یہ شعر پڑھنے لگتا۔

اے دوست کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

☆☆

طارق اسمٰعیل ساگر

میں آج تک فیصلہ نہیں کر سکا کہ طارق اسمٰعیل ساگر اوّل درجے کے صحافی ہیں یا بلند پایۂ ناول نگار...... آخر میں ایک دن اردو ادب کے راجہ اندر کے دربار میں پہنچ گیا۔ راجہ اپنی گوپیوں کا دربار سجائے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھا تو گوپیوں کو ساتھ کے کمرے میں بھیج دیا اور مجھے کہا جو بات پوچھنی ہے جلدی پوچھو؟ میں نے اپنا سوال پیش کر دیا راجہ اندر سن کر مسکرائے اور بولے ''طارق اسمٰعیل صبح کے وقت اوّل درجے کا صحافی ہوتا ہے۔ رات کو اوّل درجے کا ناول نگار! اور دلیل دی کہ صحافی صبح کے وقت کھلتا ہے ناول نگار رات کے وقت ہمارے جذبات سے کھیلتا ہے؟'' میں نے نتیجہ نکالا کہ طارق اسمٰعیل ساگر ہر فن مولا ہیں۔ ان کا شمار تجربہ کار صحافیوں میں ہوتا ہے تو وہ ملک کے مقبول ترین ناول نگار بھی ہیں۔ ان کے قارئین ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں جو ان سے ہر روز اخبار میں ملاقات کرتے ہیں اور پھر نئے ناول کی اشاعت کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ اب تک ان کے کتنے ناول چھپ چکے ہیں؟ ان کی تعداد شاید انہیں خود بھی معلوم نہیں۔ کیوں کہ اخبار کی خبر بناتے بناتے ان پر نیا دل اترنے لگتا ہے۔ ایک نقاد نے سچ کہا کہ طارق اسمٰعیل ساگر نے ناول نگاری کا فن صحافت سے سیکھا ہے۔ صحافت معاشرے کے گھمسان میں رہنے اور خبر سے افراد کی نفسیات دریافت کرنے کا فن ہے۔ ناول میں ایسی ہی کئی خبریں مل کر معاشرے کی ترجمانی بن جاتی

ہیں۔

طارق اسمٰعیل ساگر کی اس خوبی کے سب مداح ہیں کہ وہ ایک محب وطن صحافی ہیں۔ 1965ء اور 1971ء کی جنگ میں وہ خبروں کی تلاش میں بہت دور نکل گئے تھے۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو وطن کی سرزمین پیچھے رہ گئی تھی اور اپنے ملک کے دشمن کی سرزمین پر قدم رکھ چکے تھے۔ پیاس لگی تو ایک دیہاتی سے جا کر پانی مانگا اور اسی سے پتہ لگا کہ وہ اس وقت ہندوستان کی سرزمین پر تھے۔ اب ان کے اندر اچانک جاسوس بیدار ہو گیا۔ انہوں نے فوراً ایک ہندوستانی کا روپ دھار لیا اور خبریں جمع کرنے لگے۔ بعد میں انہوں نے ناول لکھا تو اس کا عنوان تھا ''میں ایک جاسوس تھا''۔

طارق اسمٰعیل ساگر نے یہ ناول اس دور میں لکھا جب نسیم حجازی، رئیس احمد جعفری اور صادق صدیقی سردھنوی کے ناول بہت مقبول تھے۔ اور کسی نئے ناول نویس کا ابھرنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن ''میں ایک جاسوس تھا'' ایک نئے موضوع پر وطنیت کے جذبے سے لکھا گیا ناول تھا۔ جس کو ملک کے لاکھوں قارئین نے 1965ء کی جنگ کے تناظر میں پڑھا اور پسند کیا۔ بہت لمبے عرصے تک سی آئی اے والے طارق اسمٰعیل کو جاسوس سمجھتے رہے اور اس کا تعاقب کرتے رہے۔ خفیہ کی ڈائریوں میں اس دور کا ریکارڈ اب بھی محفوظ ہے۔ لیکن طارق اسمٰعیل ساگر خفیہ والوں کی پرواہ کئے بغیر ناول لکھنے میں مصروف رہا۔ اس کے دو ناول ''دہشت گرد'' اور ''آخری سگنل کی کہانی'' میں ان کی وطن پرستی کے سچے جذبے شامل ہیں۔
اب میں یاد کرتا ہوں تو ان کے ناولوں کی پوری فہرست مکمل نہیں کر سکتا لیکن اس کی کتابوں میں ''وادی لہو رنگ'' ...... ''کفارہ'' ...... ''آپریشن بلیو سٹار'' ...... ''سازش'' ...... ''گرفت'' ...... ''پھندہ'' ...... ''بھٹکا ہوا راہی'' ...... ڈرگ مافیاء'' ...... ''آن دی ریکارڈ'' ...... ''تھرڈ ایجنسی'' ...... ''آخری سگنل کی کہانی'' ......اور ''وطن کی مٹی گواہ رہنا'' کے نام مجھے ذہن پر زور دیئے بغیر یاد آ رہے ہیں۔

ناول نگاری اور صحافت کی مصروفیت میں ہی انہوں نے فلم ''سلاخیں'' کی کہانی

مکمل کی اور اس کا سکرین پلے تحریر کیا۔ یہ فلم ملک کے تمام حلقوں میں پسند کی گئی اور طارق اسمٰعیل کو کئی ایوارڈز بھی دیئے گئے۔ بڑی سکرین سے طارق اسمٰعیل نے چھوٹی سکرین کی طرف بھی سفر کیا اور ٹیلی ویژن کے لئے ڈرامے لکھے جو بڑے پیمانے پر پسند کئے گئے۔

یہ تمام کہانی ایک کامیاب قلم کار کی ہے دلچسپ بات یہ ہے کہ طارق اسمٰعیل ساگر ''نوائے وقت'' میں صحافت کے دور کو اپنی زندگی کا اہم ترین دور شمار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس دور میں آتش جوان تھا اور نئے نئے تجربے کرنے میں لطف آتا تھا۔ ''نوائے وقت'' کے میگزین میں ہر ہفتے ندرت کا کوئی ایسا زاویہ ابھارتے کہ پرچے کی تعریف دور دور تک لگتی۔ لیکن پھر ایک ایسا وقت بھی آ گیا کہ وہ ''نوائے وقت'' سے رخصت ہو گئے۔ اب انہوں نے نشر و اشاعت کا اپنا ادارہ قائم کر لیا۔ اپنی اور دوسرے مصنفین کی کتابیں خود چھاپنے لگے۔ لیکن کہتے ہیں کہ جو مزہ کتابیں لکھنے میں ہے وہ کتابیں چھاپنے اور بیچنے میں نہیں۔ گویا میری زندگی کے کامیاب تجربات سے ان کا تصنیفی اشاعتی تجربہ مختلف ہے۔ طارق اسمٰعیل ساگر نے اس میدان میں دو چار ٹلے مار کر واپس صحافت اختیار کر لی۔ اب وہ کالم بھی لکھنے لگے ہیں۔ کبھی کبھی ٹیلی ویژن پر اینکر پرسن'' بن کر نمودار ہوتے ہیں تو ان کے تجزیے حالات حاضرہ کی داخلی حقیقت بیان کرتے نظر آتے ہیں اور انہیں واقعی ''جاسوس'' کہنے کو جی کر آتا ہے جو اندر کی خبر تلاش کر لاتا ہے۔ لیکن میں گواہی دیتا ہوں کہ طارق اسمٰعیل ساگر بے حد شریف انسان ہیں۔ میری خود نوشت ''سفر جاری ہے'' پر طارق اسمٰعیل ساگر نے بڑا بامعنی پُر خلوص تبصرہ کیا ہے۔

☆☆
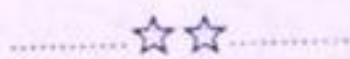
طارق شاہین

طارق شاہین میرے ایک ایسے دوست ہیں جن سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ ہندوستان کی تاریخی ریاست اندور میں آباد ہیں اور میں ان سے سینکڑوں میل دور پنجاب کی راجدھانی لاہور میں زندگی گزار رہا ہوں۔ لیکن اب دنیا کے فاصلے سمٹ گئے ہیں اور دور دور کے دیس بھی ایک ''گلوبل ولیج'' (عالمی گاؤں) میں سمٹ گئے ہیں۔ ہر شہر سے رابطہ ٹیلی فون کے ذریعے ہوسکتا ہے جس کے لئے اب تار بھی بیکار ہو گئے ہیں۔ طارق شاہین سے بھی میرا پہلا رابطہ موبائل فون سے ہوا تھا۔ مجھے ان سے غائبانہ تعارف ڈاکٹر انور سدید نے کرایا تھا جو طارق شاہین کے ادبی رسالہ ''شاخین'' کے قلمی معاون تھے۔ میری کتاب ''سفر جاری ہے'' چھپی تو انور سدید صاحب نے کہا کہ یہ کتاب طارق شاہین کو ضرور بھیجیں۔ میں نے انہیں یہ کتاب (رجسٹرڈ) ڈاک سے بھیجی کہ راستے میں گم نہ ہو جائے۔ ہندوستان میں ہوائی ڈاک بھی دیر سے پہنچتی ہے۔ لیکن میں حیران ہوا کہ صرف ایک ہفتے کے بعد طارق شاہین اس کتاب کی رسید اپنے موبائل فون پر دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ وہ اس پر تبصرہ ''شاخین'' کے زیر ترتیب شمارے میں کریں گے چنانچہ جب اگلے مہینے کا پرچہ آیا تو اس میں میرا تبصرہ موجود تھا۔ یہاں یہ بھی بتا دوں کہ طارق شاہین نے یہ تبصرہ ڈاکٹر انور سدید کو موبائل فون پر سنا دیا تھا اور ازرہ محبت کہنے لگے کہ کوئی جملہ پسند نہ آئے تو

نشان زد کر دیں۔ وہ اسے کاٹ دیں گے۔ لیکن انور سدید نے کہا کہ آپ اپنی تحریر کی آزادی کو استعمال میں لائیں اور وہ کچھ لکھنے سے گریز نہ کریں جو آپ محسوس کر رہے ہیں۔ طارق شاہین نے جواب دیا ''سفر جاری ہے'' میرے پاکستان کا تحفہ ہی نہیں بلکہ مجھے ایک یار عزیز بھی مل گیا ہے جس کا نام ملک مقبول احمد ہے۔

یہ چند سال پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد طارق شاہین سے میرا ادبی رشتہ قائم ہو گیا اور اس روز تو مجھے بہت خوشی حاصل ہوئی جب انہوں نے اپنے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لئے مجھے دعوت نامہ بھیجا۔ لیکن افسوس کہ ہندوستان کے ہائی کمشنر نے میرے پاسپورٹ پر ''اندور کے ویزے'' کی مہر نہیں لگائی۔ اور میں نے اس پرمسرت تقریب میں غائبانہ طور پر شرکت کی۔

طارق شاہین کا پیدائشی نام محمد طارق ہے۔ وہ بھارت کے مشہور شہر قنوج میں 15 جون 1944ء کو پیدا ہوئے۔ شاعری کا شوق سکول کے زمانے میں ہی پیدا ہو گیا تھا۔ اس شوق کو انہوں نے کالج کے زمانے میں خوب چمکایا اور ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں کئی مشاعرے پڑھے اور انعامات حاصل کئے۔ بی اے کرنے کے بعد انہوں نے سرکاری ملازمت کو ترجیح دی اور باٹلیرس ڈیپارٹمنٹ میں انسپکٹر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ اس عہدے پر انہوں نے چالیس سال تک باوقار خدمات انجام دیں اور اپنی دیانت اور فرض شناسی سے اس محکمے کے دوسرے ملازموں کے لئے ایک مثال قائم کر دی۔ ملازمت کے اس طویل دور میں بھی انہوں نے اپنے ذوق کی پرورش میں کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ ایک دن ٹیلی فون پر بتانے لگے کہ دفتر کی فائیلوں پر ''نوٹ'' لکھتے لکھتے میں کوئی مصرعہ نازل ہو جاتا۔ اور پھر دفتر کے کام کے ساتھ ساتھ غزل بھی مکمل ہونے لگتی۔ جسے وہ شام کو گھر آنے پر کاغذ پر لکھ لیتے۔ ان کی شاعری کا ایک مجموعہ ''سورج دیش'' چھپ چکا ہے۔ اور اس پر بھارت کے نامور نقادوں نے تبصرے لکھے ہیں۔ ایک دن میں نے پوچھا آپ اپنی نئی کتاب پر اچھا تبصرہ پڑھ کر کیا محسوس کرتے ہیں؟ کہنے لگے۔ خوشی تو ہوتی ہے لیکن میں اسے تبصرہ نگار کا اعلیٰ ذوق

وظرف قرار دے کر بھول جاتا اور مزید اچھا لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہندوستان سے رسائل آتے تو میں سب سے پہلے ان میں طارق شاہین کی غزل تلاش کرتا۔ اور ان کی معنوی تازگی میرے ذوق کو بھی طمانیت عطا کر دیتی۔

طارق شاہین نے ہندوستان میں اردو کو مقبول بنانے میں بڑا کام کیا ہے۔ انہوں نے مدھیہ پردیش کے ہائر سیکنڈری درجے کے طلباء کے لئے 12 کتابیں تالیف کیں جو نصاب کا حصہ تھیں۔ ''راحت اندوی''...... ''فن اور شخصیت'' ان کا تحقیقی کارنامہ ہے۔ طارق شاہین ادبی صحافی بھی ہیں۔ اور وہ طویل عرصے تک روزنامہ ''نو بھارت'' کا ادبی صفحہ مرتب کرتے رہے اور کئی نئے لکھنے والوں کو تخلیقی اعتماد سے سرفراز کیا۔ اندور سے ایک ادبی ماہنامہ ''تخیل'' نکلا تو اس کی ادارت بھی طارق شاہین نے کی۔ لیکن انہیں زیادہ خوشی اس روز ہوئی جب انہوں نے اپنا ذاتی رسالہ ''ادبی شاخسین'' جاری کیا۔ اور اسے بھارت ہی نہیں پوری دنیا کے اردو ادیبوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ طارق شاہین کشادہ نظر ادیب ہیں ان کا کسی گروہ سے تعلق نہیں۔ ان کی تعریف شمس الرحمان فاروقی کرتے ہیں تو گوپی چند نارنگ بھی ان کی تحسین کلماتِ خیر سے کرتے ہیں۔ پاکستان میں ان کے تعلقات وزیر آغا، احمد ندیم قاسمی دونوں سے تھے۔ ان دونوں کی وفات پر طارق شاہین نے ''ادبی شاخسین'' میں شذرات لکھے اور ان کی موت کو ادب کا نقصان قرار دیا۔

طارق شاہین اب اپنی زندگی کے 68 برس گزار چکے ہیں۔ اور اندور میں ایک نفس مطمعنہ رکھنے والے انسان کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اور ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ''سفر جاری ہے'' کے متعلق طارق شاہین کی رائے ہے کہ ''یہ کتاب اُردو ادب کے قاری کو اپنا گرویدہ بنا دے گی''۔

☆☆

طالب ہاشمی

جناب طالب ہاشمی اردو کے ایک جلیل القدر ادیب تھے جنہوں نے اپنا قلم اور ذہنی صلاحیتیں دین فطرت اسلام اور اکابر اسلام کی فضیلت کے بیان کے لئے مختص کر دی تھیں۔ ان کا اصل نام محمد یونس تھا اور وہ 26 ستمبر 1924ء کو سیالکوٹ میں موضع دھیر والی کے ایک قریشی خاندان میں پیدا ہوئے۔ یہ خاندان گزشتہ ایک صدی سے اس علاقے میں دینی خدمات انجام دے رہا تھا اور مولویوں کا خاندان مشہور تھا۔ ان کے دادا مولوی نظام الدین ایک جید عالم اور اعلیٰ پائے کے خطیب تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی زبان میں اتنی تاثیر تھی کہ مسجد کے ممبر پر کھڑے ہو کر قرآن کریم کی تلاوت کرتے تو راہ گیر ہندو سکھ اور عیسائی جمع ہو جاتے اور تلاوت سنتے رہتے۔ ان میں سے کئی لوگوں نے ان کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا۔ خدا کی وحدانیت اور نبی آخر ﷺ کی رسالت پر ایمان لائے۔ جناب طالب ہاشمی فرمایا کرتے تھے کہ ان کے قالب میں بھی اپنے دادا کی روح ہے۔ اور اسلام کی خدمت ان کے خون میں رچی بسی ہوئی ہے۔ بھٹکے ہوئے لوگوں کو صراط مستقیم پر لانا ان کی زندگی کا مقصد اولیٰ ہے۔

ان کے والد محترم کا نام محمد حسن قریشی تھا۔ انہوں نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد محکمہ ڈاک کی ملازمت اختیار کر لی کیوں کہ اس دور میں ڈاک کا محکمہ دیانتدار محکمہ شمار ہوتا تھا

اور یہاں رزق حلال حاصل کرنے کے مواقع موجود تھے۔ محمد حسین قریشی نے روکھی سوکھی کھا کر اپنے رب کا شکر ادا کیا اور سرکاری ملازمت میں بھی تبلیغ اسلام کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے صاحبزادے محمد یونس جو بعد میں طالب ہاشمی کے نام سے معروف ہوئے اپنے بچپن میں ہی بہت زیرک تھے۔ ان کی تعلیم کی طرف رغبت فطری تھی۔ سکول کے زمانے میں ہی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ لیکن ان کا رجحان دینی کتابوں کی طرف زیادہ تھا۔ تاریخ اسلام کی کتابیں بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ والد صاحب کا تبادلہ مختلف شہروں میں ہوتا رہتا تھا۔ اس لئے ان کے تعلیمی سکول بھی بدلتے رہتے۔ چنانچہ دھیڈ والی تحصیل ڈسکہ کے اس طالب علم نے میٹرک کا امتحان حسن ابدال سے پاس کیا اور پھر بی اے تک تعلیم اپنی استعداد سے پرائیویٹ طور پر مکمل کی۔

جنوری 1944ء کو انہیں اپنے والد کے محکمہ پوسٹ آفس میں مقابلے کا امتحان پاس کر کے ملازمت مل گئی۔ وہ ''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ'' کے اصول پر عمل کرتے رہے اور ریٹائرمنٹ تک محکمہ ڈاک سے وابستہ رہے۔ اس عرصے میں انہیں ملک کے کئی جید علماء سے فیض حاصل کرنے کے مواقع بھی ملے اور ان کا علمی، ادبی اور دینی ذوق پروان چڑھتا رہا آخر 1983ء میں ریٹائر ہوئے تو وہ گزیٹڈ افسر بن چکے تھے۔

طالب ہاشمی صاحب نے 20 سال کی عمر میں مضمون نگاری شروع کر دی تھی۔ مطالعے کا شوق اتنا تھا کہ چھپا ہوا ہر کاغذ غور سے پڑھتے۔ اس زمانے میں بچوں کے رسائل میں ''پھول''، ''ہونہار'' اور ''گلدستہ'' وغیرہ کو بہت شہرت حاصل تھی۔ طالب ہاشمی ان سے اتنے متاثر ہوئے کہ خود ایک قلمی رسالہ جاری کر دیا جس کے سب مضامین غور سے لکھتے تھے۔ ان کے ایک اور دوست مظہر الدین احمد صدیقی بھی اس قسم کا ایک قلمی رسالہ نکالتے تھے۔ دونوں رسائل کا تبادلہ کرتے اور ایک دوسرے سے آگے جانے کی کوشش کرتے۔ طالب ہاشمی نے 1961ء میں دینی موضوعات پر مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ روایت ہے کہ ایک رات طالب ہاشمی شبلی نعمانی کی سیرۃ النبیؐ پڑھتے پڑھتے سو گئے۔ خواب میں دیکھتے ہیں

کہ وہ مدینہ منورہ کی قدیم گلیوں میں سے گزر کر مسجد نبوی ﷺ میں پہنچ گئے۔ جہاں رسالت مآب ﷺ اپنے صحابہ کرام کے درمیان تشریف فرما تھے۔ طالب ہاشمی زیارت نبوی ﷺ سے سرفراز ہوئے تو وہ کیفیت ان کے روح میں اتر گئی۔ زبان پر کلمۂ طیبہ جاری ہو گیا اور پھر ان کی آنکھ کھل گئی تو تمام بدن پسینے سے شرابور تھا۔ اس خواب کو طالب ہاشمی نے اپنی زندگی کا اہم ترین واقعہ شمار کیا ہے۔ جس نے ان کو اس عزم راسخ پر مائل کیا کہ نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات اور نقوشِ سیرت کی تبلیغ و تحریر کے لئے زندگی وقف کر دیں گے اور یہی ان کا جادۂ حیات تھا جس پر زندگی کے آخری لمحات تک گامزن رہے۔

مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں ان سے ملنے کے لئے ان کے شفقت خانے پر اعوان ٹاؤن میں حاضر ہوتا۔ اطلاع ملتے ہی اندر بلا لیتے۔ پہلا سوال کرتے کہ دینی موضوع پر کون سی نئی کتاب شائع کی ہے۔ میں نئی کتاب پیش کرتا تو میرے سامنے پہلے سرورق پر اور پھر اس کے مندرجات پر نظر ڈالتے اور پھر دعا کے لئے ہاتھ اٹھا لیتے اور میرے ادارے کی ترقی کے لئے دعا کرتے۔ مجھے اشاعتی کام کی طرف رئیس احمد جعفری لائے تھے لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اس ادارے کی کامیابیوں میں حضرت طالب ہاشمی کی دعاؤں کا بھی اثر ہے۔
جن کی زندگی اسلامی کتابوں کی تصنیف و تالیف میں گزری۔ یہ خاکہ لکھتے ہوئے میں ان کی تصنیفات کا ذکر کرنے کے لئے یہ جگہ بہت کم محسوس کرتا ہوں۔ اس لئے چند کتابوں کے نام گنوانے پر اکتفا کروں گا۔

''معجزات سرور کونین ﷺ''، ''سفر نامہ آخرت''، ''حسنت جمیع خصالہ''، ''اخلاق پیغمبری''، ''خیر البشر''، ''حضور کے چالیس جاں نثار''، ''آسمان ہدایت کے ستر ستارے''، ''تمیں پروانے شمع رسالت کے''، ''سیرت حضرت سعد بن ابی وقاص''، ''سیرت حضرت عبداللہ بن زبیر''، ''سلطان نورالدین زنگی'' وغیرہ۔ ان کی کتابوں کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔
سیرت نگاری پر ان کو صدر پاکستان ایوارڈ بھی پیش کیا تھا۔
دین حق کی تبلیغ کے لئے وہ اٹھارہ سال تک ریڈیو پاکستان کے دینی پروگراموں

میں شرکت کرتے رہے۔ اور خاص طور پر ان اقوام کی تاریخ بیان کرتے جن کا ذکر قرآنِ حکیم میں کیا گیا ہے۔ ان کے یہ پروگرام بے حد معلوماتی ہوتے تھے اور ملک میں دلچسپی سے سنے جاتے تھے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ اب پاکستان کا یہ اسلام پسند اور دین پرست ادیب جس کے تمام انداز کریمانہ تھے اس دنیا سے اٹھ گیا ہے۔ ان کی رحلت سے لاہور ایک بڑے منارۂ نور سے محروم ہو گیا ہے۔ حق تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔

میری خودنوشت ''سفر جاری ہے'' پر طالب ہاشمی صاحب کا تبصرہ ''بیدار'' ڈائجسٹ میں شائع ہوا تھا۔ کتاب میں ادبی غلطیوں کی نشان دہی کے بعد انہوں نے لکھا تھا کہ ''بحیثیت مجموعی یہ ایک عمدہ لائق مطالعہ کتاب ہے''۔

☆☆
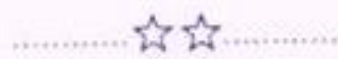
ظفر علی راجا

ظفر علی راجا کے بارے میں میرا مستقل تاثر یہ ہے کہ وہ ایک فرد نہیں بلکہ انجمن ہیں۔ ادیبوں میں ادیب، شاعروں میں شاعر، کالم نگاروں میں کالم نگار، اوّل درجے کے مزاح نگار اور اونچے درجے کے قانون دان۔ میں انہیں ''ٹین ان ون'' کی مثال قرار دیتا ہوں۔ کیونکہ کچھ پتہ نہیں کہ وہ اپنے فعال دماغ کو کس نئے شعبے میں آزمانا شروع کر دیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ظفر علی راجا نے اینیمل ہسبینڈری کالج لاہور سے شعبۂ حیوانیات میں ڈگری لی تھی لیکن پھر انہیں انسانوں کا روحانی علاج کرنے میں دلچسپی پیدا ہو گئی اور وہ ادب کی طرف آ گئے اب خبر آئی ہے کہ جب انہوں نے کالے کوٹ پہن کر وکیلوں کو مال روڈ پر احتجاجی ریلیاں نکالتے اور پولیس کے ڈنڈے کھاتے دیکھا تو انہوں نے اسلام نگر لاہور میں ایک سپر سٹور قائم کر لیا۔ لاہور کے وکیل جب لاہور کی سڑکوں پر نعرے مار رہے ہوتے ہیں ظفر علی راجا اپنے سٹور میں عوام کو اشیائے ضرورت فراہم کر رہے ہوتے ہیں۔ جب جلوس تھم جاتا ہے اور بازار کھل جاتے ہیں، عدالتوں میں مقدموں کی سماعت شروع ہو جاتی ہے تو ظفر علی راجا کالا کوٹ پہن کر ہائی کورٹ میں چلے جاتے ہیں اور اپنے مقدمے بھگتا لیتے ہیں۔ انہوں نے کبھی سرکاری نوکری نہیں کی ہمیشہ اپنی آزاد زندگی اپنی مرضی کے مطابق خود بسر کی اور ہر جگہ عزت حاصل کی۔ اس کی ایک

مثال یہ ہے کہ ہندوستان کی ایک ریاست میں ''قانون کا سیمینار'' منعقد ہوا تو لاہور سے ظفر علی راجا کو مدعو کیا گیا کہ اپنے ملک کی عدلیہ کے بارے میں اس مذاکرے میں ایک پرچہ پیش کریں۔ میں نے پوچھا آپ کا نام اتنی دور ہندوستان کے قانون دانوں کو کیسے معلوم ہو گیا؟ کہنے لگے! پس منظر تو مجھے معلوم نہیں نہ کسی نے بتایا شاید ان لوگوں نے نوائے وقت میں میرے قطعات پڑھے ہوں گے اور انہوں نے سوچا ہو گا کہ ایک ادیب وکیل کو مدعو کیا جائے جو سچ لکھتا ہے تو یہاں آ کر بھی سچ ہی بولے گا۔ ظفر علی راجا واپس آئے تو انہوں نے ہندوستان کا آنکھوں دیکھا حال اپنے سفر نامے میں لکھا جس میں ہندوستان کی عوامی عدالتوں اور معاشرے کی سچی حالت بیان کی گئی ہے اور اپنی معاشرتی کمزوریوں پر بھی کوئی پردہ نہیں ڈالا گیا۔

ظفر علی راجا کے حیوانات کے شعبے سے قانون کے پیشے میں آ جانے کی بھی ایک الگ داستان ہے وہ اس کا کریڈٹ اپنی پہلی بیگم کو دیتے ہیں جو ان کے اس پیشے سے خوش نہ تھیں۔ انہوں نے ہی راجا کو قانون کا امتحان پاس کرنے کا مشورہ دیا اور انہوں نے بیگم کے مشورے پر دل و جان سے عمل کیا تو وہ وکیل بن گئے۔ پہلے ضلع کچہری میں اپنا پھٹہ لگایا اور سیشن کورٹ تک مقدمے بھگتائے۔ ان کے فریقین ان کے جیتے ہوئے مقدموں کے خلاف اپیلیں لے کر ہائی کورٹ گئے تو راجا صاحب نے اپنے مقدمات ہائی کورٹ میں لڑنے کا خود فیصلہ کیا اور اب وہ سپریم کورٹ میں بھی رجسٹرڈ ہو چکے ہیں۔

ظفر علی راجا کو شاعری کا فطری شوق تھا۔ نثر کا اسلوب اپنی مشق سے نکھارا۔ ملک کے ممتاز مصور بشیر موجد صاحب سے دوستی ہوئی تو انہوں نے احمد ندیم قاسمی سے بھی نیاز مندی کی پرورش کی۔ پھر جب بشیر موجد وزیر آغا کے رسالہ ''اوراق'' کے سرورق بھی بنانے لگے تو ایک دن ان کے ساتھ سرگودھا پہنچ گئے اور وزیر آغا سے دوستی کا بندھن باندھ آئے۔ آغا صاحب لاہور آ گئے تو انہیں ملنے کے لیے جاتے تو بشیر موجد اور ڈاکٹر انور سدید کو بھی اپنی کار میں بٹھا لیتے۔ آغا مذاقاً پوچھتے ان دونوں سے کتنا کرایہ لیا ہے۔ ظفر علی راجا

جواب دیتے پہلے ان کی تواضع چائے اور کیک پیسٹری سے کی ہے پھر گزارش کی ہے کہ آپ کار میں تشریف رکھنے پر آمادہ ہوں تو وزیر آغا کو سلام کر آئیں۔ ان کی مہربانی ہے کہ راضی ہو گئے ہیں۔ ظفر علی راجا کی انسانی محبتوں میں میرا نام بھی شامل ہے۔ ظفر علی راجا شاعری کو اپنی پہلی محبت قرار دیتے ہیں۔ شاعری کو ہی اصل تخلیقی کام سمجھتے ہیں ان کی شاعری کی کتابوں میں ''عریاں مکان''، ''رقص تمنا'' اور مزاح کی کتاب ''قطعہ کاریاں'' شامل ہیں۔ نثری مزاح ''زاویہ ظفر''، اور ''ظفر موج'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ یہ کالم وہ لاہور کے اخبارات میں آٹھ دس سال تک لکھتے رہے۔ ایک دن ''نوائے وقت'' میں ان کا ''زرعی کالم'' دیکھا تو میں حیران ہوا کہ یہ تو ان کا شعبہ ہی نہیں تھا۔ لیکن راجا صاحب نے بتایا کہ وہ اپنی زمینوں کی کاشتکاری بھی خود کرتے ہیں اور اس تجربے پر ہی ''نوائے وقت'' میں زرعی کالم لکھتے ہیں۔ اب ان کی تقریر بازی کا ذکر کئے بغیر بھی میں نہیں رہ سکتا۔ ظفر علی راجا بہت اچھے اسٹیج سیکرٹری ہیں۔ ایک برس ایک پیشہ ور مقرر نے مجید نظامی سے حمید نظامی مرحوم کے یادگاری جلسے کی کمپیئرنگ کرنے کی درخواست کی نظامی صاحب نے انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس نیک کام کو ظفر علی راجا اس خوبی سے کر رہے ہیں کہ اب یہ روایت بن چکی ہے۔

ظفر علی راجا کی ادبی دلچسپیوں کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے اور وہ ادیبوں کے معاملات میں بھی پوری دلچسپی لیتے اور ان کے مقدمے مفت لڑتے ہیں۔ ان کے دفتر میں ادیبوں، شاعروں کا ہجوم رہتا ہے جو بالعموم ناشروں سے رائیلٹی نہ ملنے کی شکایات لے کر آتے ہیں۔ ایک دن حیرت سے کہنے لگے ''مقبول اکیڈمی کے کسی مصنف نے رائیلٹی کی کبھی شکایت نہیں کی پھر خود ہی کہنے لگے۔ کوئی شکایت کیسے کرے جب آپ کتاب لینے سے پہلے ہی رائیلٹی کا لفافہ دے آتے ہیں۔ راجا صاحب خاموشی سے کام کرنے والے انسان ہیں۔ اللہ نے ان کو ہر قسم کے انعامات سے نوازا ہے۔ ان

کی پہلی بیگم کو کینسر ہو گیا تھا۔ علاج کے لئے لندن تک گئے لیکن وہ جانبر نہ ہو سکیں۔ وفات سے پہلے وصیت کر گئی تھیں کہ راجا صاحب ان کی یاد کو دل سے بے شک لگائیں لیکن دوسری شادی ضرور کریں۔ راجا صاحب نے ان دونوں باتوں پر عمل کیا۔ ایسے لوگ پاکستان میں بہت کم ہیں۔

ظفر علی راجا نے میری سوانح حیات ''سفر جاری ہے'' پر ایک نظر افروز طویل مضمون لکھا جو روزنامہ ''راہ تلاش'' اور ''سیارہ'' ڈائجسٹ میں شائع ہوا۔

عائشہ مسعود

بحیثیت ناشر اور قاری کے میں مشاہیر کی تحریریں بالعموم اور دوستوں کی تخلیقات کو بالخصوص محبت سے پڑھتا ہوں۔ کیونکہ یہ وہ عظیم لوگ ہیں جن کے دم قدم سے مقبول اکیڈمی نے دنیائے ادب میں اپنا ایک باوقار نام پیدا کیا ہے۔ اگر چہ میری محترمہ عائشہ مسعود سے بنفیس تا حال ملاقات نہیں ہوئی لیکن ان کا کلام فکر انگیز اکثر میری نظر سے گزرتا رہا۔ لیکن میں نے پہلی بار ان کی عظیم شخصیت کو اس وقت پہچانا جب پروفیسر جمیل آذر کا ان کے تازہ مجموعہ کلام ''سخن اُس کے ستارے ہیں'' پر لکھا خوبصورت انشائی انداز میں مضمون الحمرا کے شمارہ دسمبر ۲۰۱۲ء میں پڑھا۔ میں اس وقت سے اُن کے معتقدین میں شامل ہو گیا ہوں۔ میری خواہش ہوئی ان برگزیدہ ہستیوں میں انہیں بھی شامل کروں جنہوں نے علم و ادب کی آبیاری میں اپنا خون، جگر شامل کیا۔ اس سے کچھ عرصہ قبل محترم جمیل یوسف کا ایک مضمون بھی میری نظر سے گذرا تھا۔ اس مضمون میں جناب جمیل یوسف نے انگریزی ادب کے ایک مشہور شاعر جان کیٹس کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا تھا کہ کیٹس نے کہا تھا ''اگر شاعری خود بخود (فطری طور پر) مجھ پر اس طرح نازل نہیں ہوتی جس طرح درختوں پر پتے آتے ہیں تو بہتر ہے آیا ہی نہ کرے'' آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ ''کیٹس کے یہ الفاظ عائشہ مسعود کے شعری مجموعہ ''سخن اس کے

ستارے ہیں'' کے مطالعہ کے دوران کئی مرتبہ میرے ذہن میں گونجتے رہے''
بقول جمیل یوسف عائشہ مسعود کی شاعری صدفی صد ان الفاظ پر پوری اترتی ہے۔ عائشہ مسعود معروف زمانہ غزل ''ہم تم ہوں گے بادل ہوگا'' کو اپنی سریلی آواز کا جادو جگانے والے مسعود ملک کی شریک حیات تھیں۔ (افسوس ان کا جوانی میں ہی امریکہ میں انتقال ہوگیا)

محترمہ عائشہ مسعود نے جہاں غزلوں کے اندر مختلف بحور لکھنے کا تجربہ کیا ہے وہاں انہوں نے نظموں میں بھی اپنا ایک نیا رنگ دکھایا ہے۔ ''تتلی زندہ رہنے دو'' کی ایک نظم نے بڑی شہرت حاصل کی تھی اور یہ ادب کی دنیا میں نثری نظم کے حوالے سے مشہور ہونا نئی بات ملتی ہے۔ اس نظم کا ایک ٹکڑا ملاحظہ کیجئے۔

''سارے گھر کے فرنیچر میں
مجھے پسند ہے
ٹوسٹر''

اس نظم کی روشنی میں ٹوسٹر پر اکیلا آدمی اپنے تئیں بالکل اکیلا محسوس کرتا ہے اور دوسرے شخص کی گنجائش نہیں ہوتی۔ عائشہ نے بیسیوں خوبصورت نظمیں تخلیق کیں مگر ''مسمار ہوتی تہذیب'' میں بڑا گہرا ادراک دکھائی دیتا ہے۔

''میں خود روشن عہد کی انسان تھی
پھر کسی جلتی ہوئی تہذیب کا نقشہ اٹھائے چل رہی تھی
پھر کئی اک ٹیکسلا سے شہر کی تہذیب کو مسمار دیکھتی تھی
اداس آنکھیں لئے اس غار کی جانب بڑھی
میں نے جنگل میں اتر کر پھول توڑا
اور جل بجھ کر بجھی تہذیب کے ماتھے کے اوپر رکھ دیا''

عائشہ مسعود راولپنڈی کے ایک خوش حال گھرانے میں 10 مئی 1968ء کو پیدا ہوئیں۔ اور سارا عرصہ بعد ازاں اسلام آباد میں گذرا۔ انہوں نے گریجویشن کے بعد

عربی اور فارسی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ اسلام آباد ہی میں گارڈین پبلک سکول کے نام سے اپنا ذاتی تعلیمی ادارہ چلاتی رہیں۔ اسی دوران انہوں نے امریکہ سے ابلاغِ عامہ (Mass Communication) کا ڈپلومہ حاصل کیا۔ مگر پھر بیرون ملک آنے جانے کی وجہ سے انہوں نے یہ تعلیمی ادارہ کسی اور کو سونپ دیا۔ مسعود ملک صاحب کی امریکہ میں رحلت کے بعد عائشہ مسعود چاہتی تو امریکہ میں مستقل قیام کر سکتی تھیں مگر انہوں نے اپنے لوگ اور اپنے شہر اسلام آباد میں رہنے کو ترجیح دی۔

محترمہ عائشہ مسعود روزنامہ ''نوائے وقت'' میں باقاعدگی کے ساتھ مکالمہ کے عنوان کے ساتھ کالم لکھتی ہیں جسے قارئین نہایت دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ اسی اخبار کے ادبی صفحہ کی وہ انچارج بھی ہیں۔ اسلام آباد کی آب و ہوا میں پرورش پانے والی فضا، پہاڑوں کی سرد شاموں، چاندنی راتوں کے حسن، برساتوں اور پھر خواب گلاب اور اپنی تنہائی سے محبت کرنے کے ساتھ ساتھ ملک و قوم پر چھائے ہوئے دکھوں اور سفر سے آبلہ پا ہوتے اور مسافروں کے بے پال و پر کر دیئے جانے والے جیسے روح فرسا مناظر سے بھی آشنا ہیں اور انہیں دل میں محسوس کرتی ہیں۔ عائشہ مسعود اپنے راستے میں پڑے ہوئے پتھروں اور کانٹوں کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ عائشہ مسعود کے اب تک چار شعری مجموعے، کالموں کا انتخاب اور مجید نظامی پر لکھی کتاب ''جب تک میں زندہ ہوں'' منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ وہ نثر نگاری میں بھی اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ وہ ریڈیو پاکستان کے معروف پروگرام ''آدھی دنیا پوری دنیا'' بھی کئی برس تک بطور اینکر پرسن کرتی رہی ہیں۔

عائشہ مسعود صاحبہ کو پہلے ہی شعری مجموعہ ''تتلی زندہ رہنے دو'' پر عکس خوشبو پروین شاکر ایوارڈ دیا گیا تھا۔ ازاں بعد ملک اور بیرون ملک سے ادبی خدمات کے اعتراف پر وہ کئی ایوارڈز اور تعریفی اسناد سے نوازی گئیں۔ نیویارک میں اُن کی ایک کتاب کی رونمائی کے موقع پر امریکہ کے چار کانگرس مین اور دو سینیٹرز نے شرکت کی۔

پاکستان کی کسی شاعرہ کے لیے یہ پہلا اعزاز تھا۔ دنیا کے مختلف ممالک میں وہ پاکستان کی ایک ادبی شخصیت سے نمائندگی کر چکی ہیں۔ ''سخن اس کے ستارے ہیں'' میں سے عائشہ مسعود کے لکھے گئے دیباچہ سے چند سطریں ملاحظہ کیجئے جس میں انہوں نے محبت کے تخیل، تصور اور پھر ذاتی تجربہ کو کس ہنر دوری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ''جب میں نے یہ تاج، پہنا تھا۔۔۔۔تب چودھویں کی رات تھی۔ محبت مجھ سے ہم کلام ہوئی۔ تو میں نے اس سے بات کی تھی۔ محبت نے مجھے میری زندگی سے ملایا تو زندگی نے میری آنکھوں اور میرے بازوؤں پر بوسے دیئے تھے اور پھر محبت میری حیات کا جزو بن گئی تھی۔ میری دعا ہے اللہ کرے محبت، عزت اور شہرت عائشہ کی حیات کا جزو بنتی چلی جائے۔ اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تبارک تعالیٰ سدا انہیں خوش وخرم رکھے۔ وہ قوم کا بہت بڑا اثاثہ ہیں۔ محترمہ عائشہ مسعود نے ''سفر جاری ہے'' پر جو تبصرہ کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

..........☆☆..........

پروفیسر عبدالعلیم صدیقی

جناب عبدالعلیم صدیقی کی ادبی انفرادیت یہ ہے کہ مبدائے فیاض نے انہیں شاعری کے فن سے فیضیاب کیا اور وہ اپنے تخلیقی جوہر کو قادرالکلامی سے استعمال کرنے کے پرعظمت مقام پر پہنچ گئے تو انہوں نے پاکستان کے عوام کو علامہ اقبال، مولانا روم اور عمر خیام کے فارسی کلام کو فیضیاب کرنے کا فیصلہ کیا۔ بلاشبہ وہ فارسی شاعر تھے اور شاعری کی جملہ اصناف میں اظہار کرتے تھے لیکن انہوں نے اپنی شاعری کی اشاعت پر کبھی توجہ نہیں دی لیکن متذکرہ بالا شعرا کے فارسی کلام کو اردو میں منظوم کرنے کا فریضہ ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کا اپنا مجموعہ کلام ''نہاں خانۂ دل'' ان کی وفات کے بعد ان کے بچوں نے شائع کیا لیکن کلیات اقبال (فارسی) کو ''سیر افلاک''، ''نغمہ سروش''، ''جہاں خودی'' اور ''کیا رنگ ہو تدبیر کا'' کے عنوانات سے اپنی زندگی میں شائع کیا۔ مولانا روم، سعدی شیرازی کی حکایات کے تراجم کے علاوہ رباعیاتِ عمر خیام کو اس طرح منظوم اردو میں پیش کیا کہ یہ ان کی طبع زاد تخلیقات کی طرح پڑھی جا سکتی ہیں۔ میرا اعزاز یہ ہے کہ صدیقی صاحب نے یہ سب کتابیں مقبول اکیڈمی سے شائع کرائیں اور اپنے افتخار خصوصی میں مجھے اور میرے ادارے کو بھی شامل کر لیا۔

پروفیسر عبدالعلیم صدیقی متحدہ ہندوستان کے ضلع سلطان پور میں 1925 میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے ایم اے کی ڈگری الہ آباد یونیورسٹی سے 1947 میں لی لیکن اس سے قبل انہوں نے اپنی عملی زندگی کے لیے صحافت کا شعبہ منتخب کرلیا تھا۔ انہیں سیاسی، سماجی، ادبی تہذیبی امور پر اتنا عبور حاصل تھا کہ 1945 میں جب ان کی عمر صرف 20 سال تھی۔ انہیں الہ آباد کے مشہور اخبار ''شفق'' کا ایڈیٹر مقرر کردیا گیا۔ انہوں نے اس اخبار کو ہندی مسلمانوں کے سیاسی اور معاشرتی خیالات کا ترجمان بنا دیا اور 1948 میں پاکستان کو اپنا وطن بنالیا تو اخبار ''شفق'' کی ادارت چھوڑ دی۔ وہ الہ آباد سے کراچی منتقل ہوئے تھے لیکن پھر انہیں گورنمنٹ کالج راولاکوٹ آزاد کشمیر میں فارسی زبان کے لیکچرار کی ملازمت مل گئی اور صدیقی صاحب آزاد کشمیر منتقل ہو گئے۔ یہیں انہوں نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ لیکن اپنے مطالعے کے مدار کو بھی بے پناہ وسعت دی۔

1956 میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم۔ اے اردو کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا۔ اس دوران انہوں نے میرپور اور مظفر آباد کے کالجوں میں بھی تعلیمی خدمات انجام دیں 1967 میں گورنمنٹ کالج باغ کے پرنسپل بنا دیئے گئے اس عہدے پر ان کی آخری تقرری پلندری کالج میں ہوئی اور 60 سال کی عمر کو پہنچے تو 1985 میں ریٹائر ہو گئے۔ عبدالعلیم صدیقی صاحب نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی زندگی ادب کی خدمت کے لیے وقف کردی۔ انہیں ملال تھا کہ مملکت خداداد میں فارسی کا ذوق معدوم ہوتا جارہا ہے۔ اور قومی زبان اردو کے ساتھ بھی سوتیلی ماں کا سلوک کیا جارہا ہے۔ بچوں کو انگریزی پڑھائی جارہی ہے جس میں وہ کبھی کامیابی سے سرفراز نہیں ہوئے۔ نقصان یہ ہوا کہ اردو زبان کا معیار بھی روز بروز گرتا جارہا تھا۔ اسی دور میں انہوں نے فارسی کے ممتاز شعرا رومی، سعدی

اور عمر خیام کے منظوم تراجم کا سلسلہ شروع کیا لیکن فوقیت علامہ اقبال کو دی جن کی مشہور کتابیں ''اسرار و رموز'' رموز بے خودی اور جاوید نامہ جو فارسی میں تھیں پروفیسر صدیقی صاحب نے ان سب کتابوں کو منظوم ترجمے سے اردو میں ڈھالا اور ترجمے میں تخلیق کی شان پیدا کی۔ ملک کے ممتاز نظریاتی اخبار ''نوائے وقت'' میں ان کی کتابوں پر تبصرے شائع ہوئے تو ان کی اس خدمت پر انہیں بے پناہ خراج تحسین ادا کیا گیا۔ اور ایک دفعہ تو یہ بھی لکھا گیا کہ علامہ اقبالؒ اگر زندہ ہوتے تو صدیقی صاحب کو ان کے تراجم پر داد دینے کے لیے خود آزاد کشمیر تشریف لے جاتے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس قومی خدمت کو ہر سطح پر سراہا گیا۔

کشمیر ادبی ایوارڈ 2002 میں کشمیر کلچرل اکیڈمی ایوارڈ 2005 میں پیش کیا گیا۔ صدارتی تمغہ امتیاز 2007 میں دیا گیا۔

3 دسمبر 2009 کو وہ اپنی عمر عزیز کا 84 واں برس عبور کر رہے تھے کہ داعی اجل نے موت کا پیغام دیا اور جناب عبدالعلیم صدیقی نے لبیک کہا اور اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کی وفات کے روز آزاد کشمیر ہی نہیں پورا پاکستان غم میں ڈوب گیا۔ ایک غنی مزاج ادیب جو علامہ اقبال، مولانا روم اور سعدی شیرازی کا شیدائی تھا اس دنیا سے اٹھ گیا تھا اور سچ یہ ہے کہ ادبی دنیا میں ان کی وفات سے بہت بڑا خلاء پیدا ہو گیا ہے۔

جناب عبدالعلیم صدیقی صاحب بنیادی طور پر شاعر تھے۔ لیکن فارسی، اردو اور انگریزی پر دسترس رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں عالم باعمل ہونے کا ثبوت دیا اور قوم کے بچوں کی ترتیب و تعلیم کے لیے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ ان کے طلباء اب بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں لیکن صدیقی صاحب کی زندگی درویش خرامت کی زندگی

تھی۔ ان کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ کشمیر کی آزادی نصیب ہو اور ہندوں سامراج کے شکنجے سے کشمیری مسلمانوں کو نجات مل جائے۔ انہوں نے اپنے ہزاروں طالب علموں کی تربیت اسی زاویے سے کی اور انہیں نہ صرف حب وطنی کا سبق دیا بلکہ اچھا انسان بننے اور اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کی ترغیب بھی دی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں لیکن ان کی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ اور میں نے کئی لوگوں کو یہ بات تسلیم کرتے سنا ہے کہ اقبال کے فارسی کلام کی بجائے علیم صدیقی صاحب کے منظوم ترجمے کو پڑھ کر علامہ اقبال کے مطالب و معانی کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ صدیقی صاحب نے یہ رتبۂ بلند اپنی محنت سے حاصل کیا اور اب انہیں دوام ابد کا مقام حاصل ہے۔

☆☆
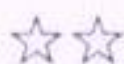
ڈاکٹر عبدالقدیر خان

علامہ اقبالؒ ملت اسلامیہ کے محسن ہیں کہ انہوں نے کفرستان ہند میں دوقومی نظریہ کا تصور ابھارا اور متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے ایک الگ اور آزاد خطۂ زمین کا مطالبہ کر دیا۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ ملت اسلامیہ کے محسن ہیں کہ انہوں نے کفرستان ہند کے مسلمانوں کو سیاسی طور پر بیدار کیا اور 23 مارچ 1940 کو صرف سات سال کی سیاسی جدوجہد سے پاکستان کو معرضِ وجود میں لے آئے۔ 14 اگست 1947ء آزاد پاکستان میں پہلی اذان گونجی تو قوم قائداعظم کی احسان مند تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد وطن حاصل کر لیا تھا جو اسلام کی تجربہ گاہ تسلیم کیا گیا لیکن جسے آل انڈیا کانگرس کے ہندو رہنما پنڈت نہرو اور ولید بھائی پٹیل جیسے انتہا پسند لیڈر...... انگریز وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کی سرپرستی میں نفرت سے دیکھ رہے تھے اور اسے مٹانے کے درپے تھے تاکہ ایک دفعہ پھر اکھنڈ بھارت وجود میں آجائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہی سرحدی لکیر میں کانٹ چھانٹ کی گئی اور مسئلہ کشمیر پیدا کر دیا گیا جس کے فیصلے کے لئے 1948، 1965ء اور 1971 میں لڑائیاں بین الاقوامی سرحد پر لڑی گئیں اور ہندوستان نے پاکستان کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے ایٹم بم بنانے میں پیش قدمی کا مظاہرہ بھی کیا۔ اس وقت پاکستان سے ذوالفقار علی بھٹو کی

آواز اٹھی کہ ہم گھاس کھالیں گے لیکن ایٹم بم ضرور بنائیں گے اور اس کا مقصد دفاعِ پاکستان ہوگا۔ اس خواب کو عملی طور پر تعبیر میں لانے کے لئے جس شخص کو محسن پاکستان تسلیم کیا گیا اس کا نام عبدالقدیر خان ہے۔ پاکستان کو ناقابل تسخیر بنانا ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا کارنامہ ہے۔ انہوں نے پاکستان کے وجود کو ایٹمی طاقت سے مرصع کر کے تحفظ عطا کیا۔ انہوں نے اٹھارہ کروڑ پاکستانیوں کی آبرو اور ان کے ایمان کی حفاظت کے لئے چاغی کے مقام پر ایٹمی دھماکے کئے اور پاکستان کے ازلی دشمن بھارت کی توپوں کا رُخ ہی نہیں موڑ دیا بلکہ اس کے ایٹمی اثاثوں کو بھی عضوِ معطل کر دیا اور پاکستان کو عسکری طاقت کے اعتبار سے ہندوستان کے برابر لا کھڑا کیا جو اس سے چار گنا زیادہ بڑا ملک ہے۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو اس ملک کا بچہ بچہ اپنا محسن سمجھتا ہے اور جن حکمرانوں نے ان پر پابندیاں عائد کیں ان کو نفرت سے دیکھتا ہے کہ وہ ایٹمی قوت رکھنے والے آزاد پاکستان کو خوئے گدائی سکھا رہے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان ایک فرد کا نام نہیں، وہ ہمہ جہت اوصاف کا مجموعہ ہیں۔ ایٹمی سائنس میں اعلیٰ درجہ حاصل کرنا اور پاکستان کے تحفظ کے لئے ایٹمی ہتھیار بنانا اور ان کا کامیاب تجربہ کرنا ان کی عظیم شخصیت کا صرف ایک رخ ہے۔ ان کی شخصیت کا دوسرا رُخ ان کی انسانیت دوستی ہے جس کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی اور ضرورت مند ان کے فیض عام سے شرابور ہو جاتا ہے۔ ان کے مزاج کا انکسار ان کی حوصلہ مندی اور دوسروں کے الزام کو اپنے سر لے کر صعوبتوں کا سامنا کرنے کی عادت بھی ان کی شخصیت کا روشن زاویہ ہے۔ ایثار اور قربانی، صبر و تحمل سے مصائب کو برداشت کرنا ان کے استقلال کے نمایاں زاویے ہیں۔ مجھے اس روز بے حد خوشی ہوئی جب انہوں نے میری ناچیز تالیف ''سفر جاری ہے'' کی ترسیل پر نہ صرف رسید سے سرفراز کیا بلکہ اپنے قلم سے مجھے خط بھی لکھا۔ ان کے ارشاداتِ عالیہ میں نے آنکھوں سے پڑھے لیکن یہ دل پر کندہ ہوتے چلے گئے۔ اور اب میں جب چاہوں گردن جھکا کر انہیں پڑھ لیتا ہوں اور میں بڑھاپے کی منزل میں نیا ولولہ نیا جوش اور نیا جذبہ محسوس کرنے لگتا ہوں۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے فرمایا تھا۔

''آپ کی زندگی کا سفر مسلسل محنت اور جدوجہد کی درخشاں کہانی ہے۔ اور آپ نے زندگی کے ایک طویل دلچسپ سفر کو قلمبند کر کے ایک دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ آپ کا پبلشنگ ادارہ مقبول اکیڈمی ایک اہم قومی ادارہ بن گیا ہے۔ جس کی زندہ مثال اس ادارہ کی گیارہ سو سے زیادہ شائع شدہ مطبوعات ہیں۔

> ''مجھے بے حد خوشی ہے کہ ملک مقبول احمد صاحب نے اپنا فن، علم اور تجربہ اپنی اگلی نسل کو منتقل کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شمع کو ہمیشہ روشن رکھے اور پاکستانی عوام کے لئے مشعل راہ بنائے''۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ان الفاظ میں ایک پیغام عمل موجود ہے جو میرے لئے ہی نہیں پاکستان کے اٹھارہ کروڑ عوام کے لئے مشعل راہ ہے۔ یعنی دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے محنت کرو اور خدا کامیابی دے تو اپنا وقت علم اور تجربہ اگل نسل کے استفادہ کے لئے تقسیم کرو اور روشنی کی شمع کو جلائے رکھو تا کہ دہر کا اندھیرا رفع ہو جائے۔

ڈاکٹر صاحب کا خط پا کر مجھے خوشی اس بات کی بھی ہوئی کہ انہوں نے میرے جیسے معمولی آدمی کی کتاب کو ہی نہیں، اس کی محنت کو بھی سراہا اور اہم پہلو یہ بھی تھا کہ ان کا مکتوب گرامی مرصع اردو میں تھا۔ تب علامہ عبدالستار عاصم نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر اعلیٰ پائے کے ادیب بھی ہیں ان کا ذوق شعر پختہ ہے اور انہیں جو شعر یا نظم پسند آئے اسے اپنی بیاض میں نقل کر لیتے ہیں۔ ان کے اس ذوق کا ہی نتیجہ ہے کہ اب وہ اردو اور انگریزی میں کالم بھی لکھ رہے ہیں اور ان کے کالموں میں قومی سیاست کے ایسے واقعات بھی درج ہوتے ہیں، جن کے شاہد صرف ڈاکٹر صاحب ہیں۔ جناب جبار مرزا نے تو ''عراضہ'' کے نام سے ایک کتاب بھی مرتب کر کے شائع کر دی ہے جس میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے اپنے سوادِ خط میں کئی کتابوں پر تبصرے شامل ہیں اور ان کے اس اعلیٰ ذوق کی نشاندہی ان کی منتخب نظموں اور غزلوں کی بیاض سے بھی ہوتی ہے جو اس کتاب میں شامل ہیں۔ یہ بیاض تحقیق کا کارنامہ نہیں بلکہ یہ ڈاکٹر صاحب کے ذوق اور شوق کا آئینہ ہے اور زندگی کے سفر میں مطالعے کے دوران جو شاعری ان کے دل کو بھائی اسے انہوں نے اپنی بیاض میں محفوظ کر لیا۔ اس میں

جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، عبدالحمید عدم، غالب، فیض احمد فیض، مومن، علامہ اقبال، اختر شیرانی، مجاز، یگانہ اور جگر کے اشعار درج ہیں تو کئی ایسے شعراء کے انتخابِ قلم بھی شامل ہیں جن کے نام شہرت کے دربار میں جگہ نہیں پا سکے لیکن ان گمنام شعراء کو بھی ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی بیاض میں باوقار جگہ ملی ہے اور اشعار کا انتخاب ان کے ذوق کا آئینہ دار بن گیا ہے۔ مثلاً ایک گمنام شاعر زخمی اکبرآبادی کا یہ قطعہ دیکھئے جو ڈاکٹر صاحب کی عملی زندگی کی نمائندگی کرتا اور ان کے تجربات کا حاصل قرار دیا جا سکتا ہے۔

میرے غم گہسار بن کر، میری زندگی سے کھیلے
میرے دشمنوں میں رہ کر مری دوستی سے کھیلے
انہیں رحم تک نہ آیا میری سادگی پہ زخمی
مجھے بے وطن سمجھ کر میری بے کسی سے کھیلے

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا مقام دنیا دار اور مفاد پرست حکمرانوں سے بلند ہے حکمرانوں کی حکمرانی چار دن کی چاندنی ثابت ہوتی ہے اور پھر تاریخ انہیں اپنے اوراق میں بھی عزت وقار کے ساتھ یاد نہیں کرتی لیکن ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے کارنامے ایسے ہیں کہ انہیں اگلی نسلیں بھی عزت اور احترام سے یاد کریں گی اور تاریخ میں ان کا نام سنہری لفظوں میں لکھا جا چکا ہے تو یہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ میری دعا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان مشکلات اور مصائب کی گونا گوئی میں اپنا مثبت کالم جاری رکھیں۔ پاکستان کی ترقی بلاشبہ اب ان کی سوچ سے بھی وابستہ ہے۔

☆☆
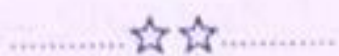
عبدالقیوم

عبدالقیوم کا نام میں نے بہت عرصہ پہلے حمید کاشمیری کی زبان سے سنا تھا جو مقبول اکیڈمی کے ایک سرگرم قلمی معاون اور مقبول مصنف تھے۔ میں اپنے ادارے کے امور کے سلسلے میں کراچی گیا اور حمید کاشمیری کی کتابوں کی دکان پر ملاقات کے لئے گیا تو انہوں نے کہا کہ اگر میں تھوڑی دیر پہلے آجاتا تو وہ میری ملاقات ایک ادیب سے کراتے جو انشائیہ، افسانہ اور مزاح میں نام پیدا کر رہا ہے۔ نام انہوں نے عبدالقیوم بتایا۔ پھر یہ نام میرے ذہن میں محفوظ ہو گیا۔ اور ادبی رسائل میں جب کبھی ان کا نام دیکھتا میں ان کا مضمون ضرور پڑھتا۔ اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کی تعریف حمید کاشمیری نے غائبانہ طور پر کی تھی۔ تاہم مجھے خوشی ہوئی کہ ان کے مضامین حمید کاشمیری کی تعریف پر پورے اترتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد ان کی کتاب ''دیدہ دانستہ'' کا مسودہ موصول ہوا تو ان کے ساتھ خط و کتابت بھی شروع ہو گئی لیکن اس وقت وہ کراچی سے اٹک منتقل ہو چکے تھے۔ اور ان کی دو کتابیں ''پیچ و تاب'' اور ''خیالی پلاؤ'' بھی شائع ہو چکی تھیں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ عبدالقیوم صاحب اپنی یہ کتابیں مجھے دینے کے لئے لاہور آئے اور پھر مقبول اکیڈمی میں مجھے ایک طویل ملاقات کا موقع بھی دیا۔ یہ غالباً 2008ء کی بات ہے جب میری کتاب ''سفر جاری ہے'' شائع ہو چکی تھی اور جب اہل ادب نے اس کی پذیرائی میں سرگرم حصہ لیا تھا ان میں جناب عبدالقیوم بھی شامل

تھے۔

عبدالقیوم دسمبر 1938ء میں ضلع اٹک کے ایک گاؤں شاہ پور میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ملک کے ممتاز اعوان قبیلے سے ہے۔ ان کے بزرگوں کا پیشہ زمینداری تھا۔ لیکن ان کا خاندان آزادی سے قبل کراچی منتقل ہو گیا تھا۔ اس وقت عبدالقیوم بچپن کے دور سے گزر رہے تھے۔ اس لئے انہوں نے پرائمری سکول سے کالج تک کی تعلیم کراچی میں ہی مکمل کی اس دور میں ہی ان کے ذوق کی پرواز ادب کی طرف ہو گئی۔ اور انہوں نے اردو کے کلاسیکی ادب کو غائر نظروں سے پڑھنا شروع کر دیا۔ ادبی حلقوں میں حاضری دینے لگے۔ لیکن زندگی کے عمل میں شامل ہونے کے لئے انہوں نے بی اے کے بعد ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔ کراچی کا یہ دور بڑی افراتفری کا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عبدالقیوم سیکنڈ ایئر کا امتحان نہ دے سکے۔ اور زندگی کی نئی راہ فلم انڈسٹری میں تلاش کرنے لگے۔

اپنی پہلی ملاقات میں عبدالقیوم نے مجھے بتایا کہ انہوں نے فلمی کہانیاں اور سکرین پلے لکھنے کے علاوہ فلم ڈائریکشن کی تربیت بھی حاصل کی۔ ان کے تکنیکی مضامین فلمی رسائل میں نمایاں طور پر شائع کئے جاتے تھے۔ مختلف تجارتی اداروں میں مختلف شعبوں میں قسمت آزمائی کرتے رہے۔ آخر انہیں فلپس الیکٹریکل کمپنی میں آفیسر اشتہارات کی ملازمت مل گئی جہاں انہوں نے اپنی محنت اور دیانت سے اپنا مقام بنا لیا۔ اس دور میں ہی ان کی ملاقات حمید کاشمیری سے ہوئی اور انہوں نے عبدالقیوم کو فلمی مضامین سے ہٹا کر ادبی مضامین لکھنے کا مشورہ دیا۔ اور ان کے اندر کے ادیب کو جگا دیا۔ عبدالقیوم نے ابتدا مزاح نگاری سے کی۔ ان کے چند مضامین ''اوراق'' کے مدیر ڈاکٹر وزیر آغا نے دیکھے تو انہیں احساس دلایا کہ ان میں انشائیہ نگاری کا جوہر موجود ہے۔ وزیر آغا کے مشورے پر ہی وہ انشائیہ نگاری کی طرف آ گئے اور اب ان کا نام انشائیہ کی کہکشاں میں روشن ستارے کی طرح چمک رہا ہے۔ میں نے ان کا تذکرہ ڈاکٹر انور سدید کے سالانہ جائزوں میں بھی پڑھا ہے۔ اور ان کے انشائیے ''اوراق'' اور ''کاغذی پیرہن'' میں بھی دیکھے ہیں۔

اردو ادب کے ساتھ عبدالقیوم کو گہری دلچسپی ہے۔ اچھی کتاب اور رسالے کا

مطالعہ کرنا ان کا شوق ہے۔لیکن وہ اپنے مطالعے کو ضائع نہیں کرتے۔ بلکہ رسالہ پڑھنے کے بعد ایڈیٹر صاحب کو طویل تجزیاتی خط ضرور لکھتے ہیں اور اس کے غیر جانبدار مبصر کی حیثیت میں بہت سے مضامین پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔عبدالقیوم کے یہ ادبی خطوط اتنے دلچسپ ہوتے ہیں کہ رسالے میں سب سے پہلے پڑھے جاتے ہیں اور مصنف اور مضمون نگاران کے لکھے ہوئے کو''سند'' تسلیم کرتے ہیں۔اور یہ بڑی بات ہے۔

عبدالقیوم صاحب نے حمید کاشمیری سے اپنے تعلقات کی داستان اپنی یادوں سے مرتب کی ہے۔ یہ سوانحی قسم کا طویل مضمون جان کاشمیری صاحب کے رسالہ ''قرطاس'' میں قسط وار چھپ چکا ہے۔اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں حمید کاشمیری کی عملی زندگی میں جدوجہد کے علاوہ کراچی کا ادبی منظرنامہ بھی سما گیا ہے۔اگر یہ کتابی صورت میں چھپ جائے تو اسے عبدالقیوم کی ادبی زندگی میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہوگی۔حال ہی میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ عبدالقیوم اپنی سوانح عمری بھی خود لکھ رہے ہیں۔میں جب اپنی زندگی کے حالات ''سفر جاری ہے'' کے نام سے لکھ رہا تھا تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ ایک فلم دیکھ رہا ہوں جس کی کہانی کاغذ پر اترتی جارہی ہے۔عبدالقیوم صاحب نے بھی کراچی میں بھرپور زندگی گزاری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی کہانی جب ان کے زبانی بیان ہوگی تو اس کا خیر مقدم بھی وسیع پیمانے پر کیا جائے گا۔ بقول شخصے ہر شخص کی زندگی دوسروں سے الگ ہوتی ہے اور ایک ناول کی حیثیت رکھتی ہے جس کے واقعات اور کردار حقیقی ہوتے ہیں۔ مجھے اس خودنوشت سوانح عمری کا انتظار ہے۔میری خودنوشت ''سفر جاری ہے'' پر ان کا تبصرہ کشادہ نظری کا مظہر ہے۔

☆☆

ڈاکٹر عبدالکریم خالد

ایک لمبے عرصے تک لاہور کے شریف النفس ادیبوں کا ذکر آتا تو میں سب سے پہلے معروف افسانہ نگار غلام الثقلین نقوی کا نام لیتا اور اس کے بعد متعدد دوسرے ادیبوں کا نام لیتا جن کی شرافت ان کے کردار کی اہم ترین خصوصیت نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالکریم خالد ایسے ہی ادیبوں میں شامل ہیں جن کی شرافت کی قسم دی جا سکتی ہے اور جن کے قول اور فعل میں تضاد نہیں ہے۔ بعض لوگ تو ان کی شرافت کی وجہ سے ہی انہیں انیسویں صدی کا انسان شمار کرتے ہیں۔

آپ حیران ہوں گے کہ عبدالکریم خالد سے میرا رابطہ ایک ناشر کی حیثیت سے کبھی نہیں ہوا۔ وہ مطالعہ کے رسیا ہیں اور نئی کتابوں کی تلاش میں ہی مقبول اکیڈمی پر تشریف لاتے ہیں اور جب آتے ہیں تو خاموشی سے کتابوں کے شیلفوں کا جائزہ لیتے اور اپنی پسند کی کتابیں نکال کر الگ رکھتے جاتے ہیں۔ بل بنوا کر ادائیگی کرتے ہیں اور کتابوں کا بنڈل اٹھا کر اپنی ایجوکیشن یونیورسٹی کی راہ لیتے ہیں۔ وہ اظہر جاوید کے خاص الخاص دوستوں میں سے ہیں۔ ایک دن میں نے اظہر جاوید سے پوچھا ''عبدالکریم خالد اتنے خاموش کیوں رہتے ہیں''۔ اظہر جاوید بولے ''یہ اپنی ''انرجی'' ضائع نہیں کرتے۔ اسے کلاس روم میں استعمال کرتے ہیں۔ دوسرے وہ اختلاف کو پالنے والے پروفیسر نہیں بلکہ تہذیب اور

اخلاق کے پاسدار ہیں''۔ اظہر جاوید صاحب کی یہ بات سن کر میرے دل میں ڈاکٹر عبدالکریم خالد کی عزت اور بڑھ گئی۔

معروف محقق، نقاد اور ماہر تعلیم ڈاکٹر عبدالکریم خالد 15 اگست 1952ء کو ایک معروف معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ 16 سال کی عمر میں سرگودھا بورڈ سے میٹرک اول پوزیشن میں کیا اور ایم اے تک تمام مراحل کامیابی سے طے کئے۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری 2006ء میں پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔عملی زندگی کی ابتدا گورنمنٹ ایف سی کالج لاہور سے کی، یہاں آپ کالج کی بزم ادب کے نگران رہے اور طلبا میں ادب کا ذوق پیدا کرنے کے لیے خصوصی خدمات انجام دیں۔

ڈاکٹر عبدالکریم خالد ایک طویل عرصے تک رسالہ ''شام وسحر'' میں ہر سال ادب کا جائزہ لکھا کرتے تھے۔ ان کا جائزہ صرف اس رسالے کے ایک سال کے بارہ شمارے تک محدود ہوتا تھا لیکن وہ ہر تخلیق کا تذکرہ اس طرح کرتے کہ لکھنے والوں کو مزید اچھا لکھنے کی تحریک ملتی۔ پھر وہ پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے میں مصروف ہو گئے اور جائزہ نگاری کا کام موقوف ہو گیا۔ ایک دن میں نے ڈاکٹر انور سدید کو افسوس کرتے ہوئے دیکھا کہ اردو دنیا میں ایک نیا جائزہ نگار سامنے آیا تھا لیکن وہ اس میدان کو ہی چھوڑ گئے۔ ان کا اشارہ عبدالکریم خالد کی طرف تھا۔ لیکن واضح رہے کہ وہ ان دونوں اردو کے مشہور افسانہ نگار ممتاز مفتی کے افسانوی ادب میں نفسیات نگاری کے موضوع پر پی ایچ ڈی سطح کا مقالہ لکھنے میں مصروف ہو گئے تھے اور کہتے تھے کہ اس ادبی مصروفیت کی وجہ سے وہ ''شام وسحر'' کے سالانہ جائزہ سے انصاف نہیں کر سکتے تھے۔ ممتاز مفتی کا موضوع انہوں نے بے وجہ منتخب نہیں کیا تھا۔ بلکہ ان کا خیال تھا کہ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو کا معاصر ہونے کے باوجود اس دور کے نقادوں نے ممتاز مفتی کو نظر انداز کیا تھا۔ پھر جب اس کا نام لیا جانے لگا تو بات ان کے افسانے ''آپا'' سے آگے نہ بڑھتی۔ ڈاکٹر صاحب نے ممتاز مفتی کے فن کے ایسے گوشے تلاش کئے جو روایتی نقادوں کی نظر میں نہیں آئے تھے۔

ڈاکٹر عبدالکریم خالد بنیادی طور پر ایک استاد ہیں۔ اور وہ درس وتدریس پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابوں کی تعداد زیادہ نہیں۔ ان کی تنقید کی کتاب

''نئے پرانے مضامین'' کو اہل ادب نے تحسین کی نظر سے دیکھا تھا اور اس پر بڑے عمدہ تبصرے چھپے تھے۔ ڈاکٹر صاحب شعر بھی کہتے ہیں لیکن اس صنف ادب میں بھی ان کی تخلیق کاری کی کثرت نظر نہیں آتی۔ میں نے سنا تھا کہ ان کی شاعری کا مجموعہ ''ہم اگر خواب ہوتے'' کے نام سے چھپ رہا ہے۔ لیکن تا حال شائع نہیں ہوا اور عدم اشاعت کی وجہ سے ان کی بے نیازی کے سوا اور کوئی بات نظر نہیں آتی۔

ڈاکٹر عبدالکریم خالد کا ادیبوں کے کسی گروہ سے تعلق نہیں ہے۔ وہ ڈاکٹر وزیر آغا کے فکر اور فن کے قدر دان ہیں۔ وزیر آغا صاحب کی وفات کے بعد انہوں نے وزیر آغا پر نئے زاویوں سے مضامین لکھے ہیں اور قاسمی صاحب کو بھی کبھی نظر انداز نہیں کیا۔

عمران نقوی نے ان کا انٹرویو اپنے اخبار ''پاکستان'' کے لئے لیا تو خاص طور پر ایک سوال درسی نقادوں اور مدرسانہ تنقید کے بارے میں پوچھا۔ ڈاکٹر خالد صاحب نے اسے کالج اور یونیورسٹی کے ان اساتذہ پر پھبتی قرار دیا جو ادب پڑھاتے ہیں اور تنقید لکھتے ہیں۔ لیکن اگر ایک استاد کا مطالعہ وسیع ہے اور وہ ''کلاس نوٹس'' نہیں لکھتا تو اس کو ''درسی نقاد'' کہنا موزوں نہیں ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے جن چار بڑے نقادوں کے نام لئے تو تین نقاد ڈاکٹر وزیر آغا کے بعد ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر جمیل جالبی تھے اور چوتھا نام ڈاکٹر انور سدید کا نام تھا۔

میں ان کو انصاف پسند نقاد شمار کرتا ہوں۔ میری کتاب ''سیاحت نامہ ترکی'' چھپی تو اس پر انہوں نے چند سطروں کا رسمی تبصرہ نہیں لکھا بلکہ رسالہ ''تخلیق'' میں پورا مقالہ لکھا جسے بہت پسند کیا گیا۔ اخبار میں جائزہ لکھتے تو میرے معمولی کام کا ذکر اس طرح کرتے کہ بعض لوگ مجھے غیر معمولی سمجھنے لگتے اور میں فخر محسوس کرتا۔ میں ان کا شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر عبدالکریم خالد ان دنوں یونیورسٹی آف ایجوکیشن لاہور میں شعبہ اردو کے صدر ہیں۔ اور ایسے استاد شمار ہوتے ہیں جن کی تعریف ان کے طلباء کرتے ہیں۔ وہ اس وقت ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے سکالرز کے مقالات کی نگرانی بھی کر رہے ہیں۔ اور ان کے دل میں ادب لکھنے کا ذوق بھی پیدا کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر عبدالکریم خالد یونیورسٹیوں کے دوسرے اساتذہ سے مختلف ہیں۔ یعنی وہ ''ادیب گری'' بھی کر رہے

ہیں۔ان کے طلبا اور طالبات زمانہ طالب علمی میں ہی کتابوں کے مصنف بن جاتے ہیں۔
اب آخر میں ڈاکٹر صاحب کی غزل کا ایک شعر سن لیجئے۔ جس میں روایت کو قائم رکھتے ہوئے جدت اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔اور اس سے ان کے کردار کا زاویہ بھی اجاگر ہوتا ہے۔

☆☆
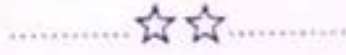
پروفیسر عثمان علی

پروفیسر عثمان علی کی ولادت شمالی علاقہ جات کے اس مقام پر ہوئی جو گرمی ہو یا سردی ہر وقت برف کی چادر میں لپٹا رہتا ہے۔ یہ علاقہ گلگت کے نام سے موسوم ہوتا ہے اور ترقی یافتہ علاقوں سے بہت دور ہونے کی وجہ سے پسماندہ ہے۔ عثمان علی گلگت کے محلّہ کسروٹ میں 4 جون 1934 کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد جناب محمد یوسف نے ابتدا سے ہی اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کرنے کا ارادہ باندھ لیا۔ اور عثمان علی نے ہوش سنبھالی تو انہیں ابتدائی قاعدہ پکڑا کر مقامی مدرسے میں بٹھا دیا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم علاقائی مدرسوں میں حاصل کی اور حصولِ تعلیم کے شوق نے ایسا رنگ پکڑا کہ گلگت سے پشاور چلے گئے جہاں انہوں نے بی ایڈ کیا اور طلائی تمغے حاصل کیے۔ پشاور نے ان کے تعلیمی شوق کو جنون میں بدل دیا اور وہ پنجاب یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے۔ انہوں نے ایم اے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ لاہور کی ادبی اور تہذیبی رعنائیاں عثمان علی صاحب کا دامن کھینچ نہ سکیں۔ اور ایم اے کرنے کے بعد وہ واپس گلگت چلے گئے اور اس علاقے کی عملی پسماندگی دور کرنے کے لئے محکمہ تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔ اس دوران انہوں نے سعودی عرب، عوامی جمہوریہ چین اور امریکہ کے دورے بھی کئے اور اس امر کا خاص طور پر مطالعہ کیا کہ ان ممالک نے تعلیم میں کس طرح ترقی کی ہے کہ آج پوری دنیا کی رہنمائی کر

رہے ہیں۔ وطن واپس آکر انہوں نے طلباء کی تعلیم کو جدید اصولوں کے مطابق استوار کیا لیکن علاقے کی پسماندگی، وسائل کی کمی اور حالات کی ناموافقت نے ان کی سرگرمیوں کا دائرہ پھیلنے کا موقع نہ دیا۔ لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری اور دستیاب وسائل کو ہی کام میں لاکر اپنے طالب علموں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرتے رہے اور آخر 4 جون 1994 کو 60 سال کی عمر کو پہنچنے پر سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوگئے۔ ان کی تعلیمی سرگرمیوں کو دیکھ کر علاقے کے عوام اور خواص نے ان کو گلگت کا سرسید احمد خان تسلیم کرلیا۔ واقعی یہ رتبہ بلند اسی کو ملا جسے خدا نے عطا کیا جبکہ ہر شخص یہ مقام حاصل نہیں کرسکتا۔ پروفیسر عثمان علی کی انفرادی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے ان اساتذہ کو ہمیشہ عقیدت سے یاد کرتے ہیں جن سے انہیں فیض علم حاصل ہوا ان میں سے چند نام یہ ہیں ماسٹر دولت علی، جلال الدین خلجی، پروفیسر عبدالحیٔ علوی، مولانا نورالحق ندوی، مولوی راجی الرحمت۔ تعلیمی میدان سے باہر انہوں نے جن شخصیات سے استفادہ کیا وہ بھی ان کی عقیدت اور ستائش کا مرکز ہیں ان میں سرحد کے سیاسی رہنما خان ولی خان کے بھائی عبدالعلی خان، پروفیسر مبارک حسین شاہ، عبداللہ خادم حسین اور ڈاکٹر ممتاز منگلوری کے نام اہم ہیں۔ ان کے اعزازات کی فہرست اتنی لمبی ہے کہ میرے لئے شمار کرنا مشکل ہے۔

سرکاری ملازمت کے بعد پروفیسر عثمان علی کے جنون نے ان کو فارغ بیٹھنے نہیں دیا۔ چنانچہ وہ درس وتدریس سے تصنیف وتالیف کی طرف آگئے۔ اب تک ان کی بیس سے زیادہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ مقبول اکیڈمی کو فخر ہے کہ پروفیسر عثمان علی کی زیادہ کتابیں اس ادارے سے شائع ہوئی ہیں۔ میرا اور ان کا تعلق اس مقام پر پہنچ گیا جہاں دوئی ختم ہو جاتی ہے اور ناشر اور مصنف یک جان ودوقلب ہوجاتے ہیں۔

پروفیسر عثمان علی نہایت پاکیزہ خیالات کے مالک ہیں۔ انسانیت کی خدمت کو فرض عین سمجھتے ہیں اور کتابوں کا مطالعہ ان کو ذہنی طمانیت عطا کرتا ہے۔ انہوں نے ''کتاب'' کے بارے میں ان سنہری خیالات کا اظہار کیا ہے۔

''میرے نزدیک کتاب زندگی ہے۔ کتاب انسانی معاشرے کو تسلسل

فراہم کرتی ہے۔ دنیا آج بالکل ادھر ادھر ہو جائے پھر بھی ہم کتاب کے مرہون منت رہیں گے۔''

میری کتاب ''سفر جاری ہے'' کو انہوں نے بڑی کشادہ نظری سے سراہا تھا اور جب ''پذیرائی'' شائع ہوئی تو لکھا:

''پذیرائی'' ادب میں ایک نئی جہت کی شروعات بھی ہے۔ جس میں ادبا، شعرا، نثار اور دانشوران کا ایک کنبہ ایک منزل کی طرف رواں دواں دکھائی دیتا ہے۔ منزل دور ہے اور یقیناً سفر جاری رہے گا۔''

پروفیسر عثمان علی کا آخری جملہ اتنا اثر انگیز تھا کہ میں نے اپنے سفر کو بہتر تر کر دیا اور اس احساس کو قریب نہ آنے دیا کہ بڑھاپے نے مجھ پر حملہ کر دیا ہے اور میرے اعصاب کمزور ہو گئے ہیں۔ میں نے پروفیسر عثمان کا خط ملنے کے بعد ہی کتاب ''شناسائی'' شائع کی۔

''آپس کی باتیں''، ''برسبیل گفتگو'' اور ''پچاس نامور ادبی شخصیات'' کا مواد اخبارات اور رسائل سے جمع کیا اور اب کتاب ''ادب شناسی'' بھی مرتب کر لی ہے۔ اور اس یقین سے بھی سرشار ہوں کہ ''سفر جاری ہے'' اور یہ سفر جاری رہے گا...... پروفیسر عثمان علی صاحب! اس نیک مشورے کے لئے شکریہ۔ صد شکریہ۔

............☆☆............

حکیم عزیز الرحمٰن جگرانوی

حکیم عزیز الرحمٰن جگرانوی کا تعلق برصغیر کے اس خاندان حکماء سے ہے جن کے لئے طب انسانی خدمت کا وسیلہ تھا اور ادب روح کی تسکین کی غذا شمار ہوتی تھی۔ میں جب کبھی عزیز الرحمٰن جگرانوی صاحب سے دن کے وقت ملنے کے لئے گیا تو انہیں مریضوں کے ہجوم میں گھرا ہوا دیکھا لیکن جب کبھی دن ڈھلے ملاقات ہوئی تو ان کے ہاتھ میں کتاب دیکھی اور پھر میری یہ عادت بن گئی کہ مقبول اکیڈمی سے جب کوئی نئی کتاب شائع ہوتی تو میں یہ کتاب لے کر حکیم صاحب کی خدمت میں خود حاضر ہوتا۔ حکیم صاحب کتاب دیکھ کر کھل اٹھتے اور اگلی ملاقات میں اس پر سیر حاصل تبصرہ بھی فرماتے اور یہ امر تو مجھے خصوصی طور پر یاد ہے کہ میری سوانح عمری ''سفر جاری ہے'' پڑھی تو اس کے کئی نکات پر حکیم صاحب نے مجھے داد دی اور میری محنت کو سراہا۔

ادب حکیم صاحب کی روحانی غذا ہے۔ اور حکمت ان کی خاندانی وراثت ہے۔ ان کے پردادا حکیم عزیز اللہ کا شمار پاک و ہند کے مشہور و عظیم حکیموں میں ہوتا تھا۔ وہ اپنے دور کے مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے خصوصی معالجوں میں شامل تھے اور یہ ان کا خصوصی اعزاز تھا کہ بہادر شاہ ظفر ان کے نسخہ جات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور انہیں استعمال میں لاتے تو جلد صحت یاب ہو جاتے۔ ان کے دادا حکیم محمد اسمٰعیل نے 1887ء میں طبیہ کالج دہلی سے

حکمت کی اعلیٰ سند حاصل کی اور مغلیہ دور کے باقی ماندہ شہزادوں کے طبیب کی خدمات انجام دیں۔ یہ خاندان آزادی کے بعد 1947ء میں جگراؤں ضلع لدھیانہ سے ہجرت کر کے لاہور آ گیا۔ اس صوبائی دارالحکومت میں اسی خاندان کے سرپرست حکیم محمد شریف جگرانوی تھے وہ طبیہ کالج لاہور میں طب کی تعلیم پر مامور رہے اور طبی کونسل آف پاکستان میں چیئرمین کی خدمات بھی انجام دیں۔

حکیم محمد عزیز الرحمٰن جگرانوی 3 جولائی 1954ء کو جناب حکیم عبدالخالق جگرانوی کے ہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اس شہر بے مثال لاہور میں حاصل کی اور اپنی دانش و ذہانت سے تمام امتحانوں میں اعلیٰ پوزیشن حاصل کی۔ ان کے والد گرامی نے ابتدا سے ہی انہیں طب کے امور میں تربیت دینی شروع کر دی تھی۔ چنانچہ طب و جراحت کی سند حاصل کرنے کے لئے طبیہ کالج لاہور میں داخل کرا دیا اور عملی تربیت اپنے مطب میں دی۔ حکیم عزیز الرحمٰن جگرانوی اپنی طالب علمی کے زمانے میں مریضوں کی نبض شناسی کرنے اور نسخے تجویز کرنے لگے تھے جو تیر بہدف ثابت ہوتے اور مریض صحت یاب ہو جاتے۔ صحت پانے کے بعد جب مریض شکریہ ادا کرنے کے لئے حاضر ہوتے تو حکیم عزیز الرحمان کہتے شفا تو اللہ کی طرف سے نصیب ہوتی ہے۔ حکیم کا کام تو مرض کی تشخیص اور اس کے لئے دوا تجویز کرنا ہے۔

طبی تعلیم کی تکمیل کے بعد انہوں نے اپنا مطب شروع کیا تو ان کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی لیکن انہوں نے حکمت کو کبھی کاروبار نہیں بنایا بلکہ اسے انسانی خدمت کا وسیلہ سمجھا۔ چنانچہ طب نبوی ﷺ کے فروغ میں ان کی خدمات کا اعتراف ہر سطح پر کیا گیا ہے۔

ان کے مطب میں حاضر ہونے والے مریض بتاتے ہیں کہ حکیم صاحب نبض پر ہاتھ رکھتے ہیں تو ان کے دل میں یقین ہو جاتا ہے کہ اب مرض بھاگ جائے گا اور انہیں شفا نصیب ہو گی۔ اور واقعی ایسا ہی ہوتا ہے۔ ان کے گلبرگ کے مطب میں روزانہ سینکڑوں مریض آتے ہیں اور جب تک آخری مریض کو حکیم صاحب دیکھ نہ لیں اور نسخہ تجویز کر کے دوا دے نہ دیں اس وقت تک مطب سے نہیں اٹھتے۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ حکیم صاحب نادار اور غریب

مریضوں کا علاج مفت کرتے ہیں اور ادویات بھی بلا قیمت پیش کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ دوا کی قیمت روپیہ پیسہ نہیں بلکہ مریض کی دعائیں ہیں۔

حکیم عزیز الرحمان جگرانوی دراصل اپنے بزرگوں کی روایت کو ہی نبھا رہے ہیں اور اس دور میں جبکہ کئی قسم کی دوائیں ایجاد ہو گئی ہیں طب نبوی ﷺ کو فروغ دے رہے ہیں۔

حکیم عزیز الرحمٰن جگرانوی اعلیٰ پائے کے مصنف اور محقق بھی ہیں۔ انہوں نے طب نبوی ﷺ، روحانیات، اسلامیات حتیٰ کہ ادب کے سماجی موضوعات پر ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ انہیں قومی امن کمیٹی برائے بین المذاہب ہم آہنگی کے پاکستان مرکز کا وائس چیئرمین منتخب کیا گیا۔ حکومت پاکستان کی علماء مشائخ کونسل کے بھی وائس چیئرمین ہیں۔ کئی فلاحی ٹرسٹوں کے صدر ہیں۔ بے شمار غیر سرکاری ادارے ان کی سرپرستی میں چل رہے ہیں۔ اہم بات یہ کہ وہ دوبئی کے شاہی خاندان کے معالج خصوصی ہیں۔ شعبہ طب نبویؐ میں جدید ترین تحقیقات ان کا مشغلہ ہے۔

حکیم صاحب نے اپنے تین صاحبزادوں...... محمد ہارون عزیز جگرانوی...... مامون عزیز جگرانوی...... اور عاطف عزیز جگرانوی کو بھی شعبہ طب میں نمایاں مقام حاصل کرنے میں معاونت کی ہے۔ بلاشبہ ''جگراؤں'' اب ہندوستانی پنجاب میں رہ گیا ہے لیکن اس قصبے کی اصلی روح حکیم عزیز الرحمٰن جگرانوی کی صورت میں لاہور میں موجود ہے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ حکیم صاحب میرے دوست ہیں۔ محسن ہیں، کرم فرما ہیں اور میں ان کے ادبی ذوق کا قدردان اور ثنا خوان ہوں۔ اور ان کے دست شفا سے فیض حاصل کرتا ہوں۔

☆☆
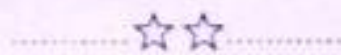
عشرت رحمانی

عشرت رحمانی بنیادی طور پر ادیب تھے لیکن انہوں نے زندگی کا بیشتر حصہ ریڈیو کے ساتھ وابستگی میں گزارا۔ ان کا اصلی نام امتیاز علی خان تھا، وہ رام پور جیسے مردم خیز خطہ میں 1910ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم رام پور کے ریاستی مدرستوں میں حاصل کی اور اس ریاست کے ذہین ترین طلبا میں شمار ہوئے، جن کو اُردو ادب کے ساتھ گہری وابستگی تھی۔ مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ چلے گئے اور بی اے 1931ء میں کیا۔ اب ان کی دلچسپی تاریخ میں پیدا ہوگئی اور وہ اخبارات میں سیاسی موضوعات پر مضامین لکھنے لگے اور علی گڑھ یونیورسٹی سے 1938ء میں تاریخ میں ایم اے کی ڈگری لی اور آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے اور آزادی کے بعد پاکستان آئے تو ریڈیو لاہور میں ملازمت اختیار کی۔ پچاس سال کی عمر کو پہنچے تو 1960ء میں ریٹائرمنٹ اختیار کر لی اور پھر اپنی پوری زندگی اُردو ادب کی حدمت کے لئے وقف کر دی۔

عشرت رحمانی صاحب بے حد زود نویس ادیب تھے۔ تاریخ اور افسانہ ان کی دلچسپی کے موضوعات تھے، ان کی دوسری بڑی دلچسپی ڈرامے سے تھی۔ انہوں نے ریڈیو کے لئے نہ صرف اعلیٰ پائے کے ڈرامے لکھے بلکہ ریڈیو پر ڈراما پروڈیوس کرنے میں بھی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ عشرت رحمانی کی تصانیف کی تعداد بے شمار ہے۔ ان کی

مشہور کتابوں میں ''اُردو ڈراما کی تاریخ تنقید''، ''اُردو ڈرامے کا ارتقاء'' ''ہماری آزادی کی کہانی (5 جلدیں)''، ''قائداعظم محمد علی جناح''، ''ریڈیو فیچروں کی ایک کتاب''، ''6 ستمبر''، ''حکایاتِ بصیرت'' ان کے ایک ناول کا نام ''بوٹا سنگھ'' ہے۔ اس کا مرکزی کردار بوٹا سنگھ ایک عورت زینب کے عشق میں مبتلا تھا جسے آزادی کے وقت سکھوں نے اغوا کرلیا تھا۔ بوٹا سنگھ نے اس کے ساتھ شادی کرلی تھی، لیکن پاکستان کی حکومت جب زینت کو بازیافت کر کے لاہور لے آئی تو بوٹا سنگھ اس کی مفارقت برداشت نہ کرسکا اور لاہور آگیا، جہاں پولیس نے اسے دھرلیا۔ بوٹا سنگھ نے عشق کی ناکامی میں خودکشی کرلی تھی۔ اس خبر کے چھپنے کے ایک ہفتے بعد عشرت رحمانی کا ناول بازار میں آگیا جو گرم کیکوں کی طرح فروخت ہوا، اس ایک واقعے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کتنے زودنویس ادیب تھے۔

عشرت رحمانی پرانی قدروں کے وضع دار ادیب تھے۔ کتابوں کا مطالعہ ان کا شوق تھا، ان کی اپنی ذاتی لائبریری میں ہزاروں کتابیں تھیں۔ کہا کرتے تھے کہ اچھی کتاب خریدنا ان کا مشغلہ نہیں، عشق ہے۔ زیرِتصنیف کتاب کے لئے حوالے کی تمام کتابیں وہ اپنی لائبریری کے لئے خرید لیتے تھے۔ اوّل درجے کا مواد حاصل کرنے کے بعد وہ مختلف کتابوں سے اپنے موضوع کے حصے نشان زدہ کردیتے اور ان کے تجزیے سے اپنے مطالب ومعانی نکالتے تھے۔

عشرت رحمانی بہت خوش اخلاق، بے حد ملنسار اور عجز وانکسار کا مجسمہ تھے۔ میں جب بھی ملاقات کے لیے حاضر ہوتا وہ اپنا مطالعہ چھوڑ کر میرے ساتھ گفتگو کرنے لگتے۔ اپنے سابقہ تصنیفی کام کا ذکر کرتے اور آئندہ کے منصوبوں کا خاکہ بھی سناتے چلے جاتے۔ میری پسند کی کتاب مجھے اشاعت کے لئے دینے میں ذرا بھر تامل نہ کرتے۔ اس کے ساتھ ہی وہ بڑے اصرار سے چائے منگواتے، جس کے لوازمات میں کئی لذیذ چیزیں شامل ہوتیں۔ مقبول اکیڈمی سے ان کی جو کتابیں شائع ہوئیں ان میں ''حکایاتِ بصیرت''، ''جنگ آزادی کے نامور مجاہدین''، ''تاریخ سیاست ملی''، ''حیات جوہر''، ''معلم

اخلاق''، اور''پاکستان سے پاکستان تک'' کے علاوہ ''اسلامی تہذیب وتمدن'' شامل ہیں۔عشرت رحمانی نے اپنی خودنوشت سوانح عمری لکھنے کا سلسلہ ایک اخبار میں شروع کیا تھا، بعد میں کتاب ''عشرتِ فانی'' کے نام سے شائع ہوئی اور اُردو کی خودنوشت سوانح عمریوں میں اوّل درجے کی تالیف تسلیم کی گئی۔اس کتاب میں عشرت رحمانی نے زیادہ سے زیادہ سچ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں کہ آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے دوران وہ لکھنؤ میں رہتے تھے۔اس شہر کی سب طوائفوں سے ان کے تعلقات خوشگوار تھے اور وہ ہر مغنیہ کو ریڈیو پر متعارف کراتے تھے، چنانچہ انہیں لکھنؤ کے اُس بازار کی ''دائی' مشہور کردیا گیا،لیکن انہوں نے اس کا برا نہیں منایا، بلکہ ان گانے والیوں کا حال اپنی خود نوشت میں مزے لے لے کر لکھا۔

ایک اور دلچسپ واقعہ ان کا ''نکاحِ ثانی'' تھا۔وہ راولپنڈی سے لاہور آتے تو ایک عزیزہ کے پاس ٹھہرتے تھے، جو بیوہ تھی۔ جب ان کی اس رہائش پر انگلیاں اٹھنے لگیں تو انہوں نے اپنی اس بیوہ عزیزہ سے نکاح ثانی کرلیا اور اعتراض کرنے والوں کا منہ بند کردیا۔

عشرت رحمانی نے لاہور میں وفات پائی، افسوس کی بات یہ ہے کہ ریڈیو لاہور نے ان کا نام یکسر بھلا دیا ہے۔مقبول اکیڈمی کے صدر دفتر میں جب تاریخی کتابوں کا ذکر ہو تو عشرت رحمانی کا تذکرہ بھی ہوتا ہے اور میں اس وضعدار شخصیت کے لئے دعائے فاتحہ ضرور پڑھتا ہوں، حق تعالیٰ ان کو جنت میں جگہ دے۔

☆☆

پروفیسر علی احمد فاطمی

ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کو جس ایک شخص نے زندہ رکھنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ وہ الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر علی احمد فاطمی ہیں۔ فاطمی صاحب کو حالیہ دور میں اس تحریک کے تعارف نگار کا درجہ حاصل ہے۔ تو وہ اس تحریک کے نظریاتی مبلغ بھی ہیں اور مورخ بھی، وکیل بھی ہیں اور منصب بھی، ان کا مطالعہ بے حد وسیع ہے اور تلاش صداقت ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر محمد عقیل اور ڈاکٹر قمر رئیس کی وفات کے بعد انہیں ترقی پسند تحریک کا سب سے فعال رکن تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے مزاج کا انکسار ان کی سب سے بڑی خوبی ہے اور اپنی انا کو انہوں نے کبھی پھولنے نہیں دیا۔

علی احمد فاطمی 1954ء میں پیدا ہوئے۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری الہ آباد یونیورسٹی سے 1979ء میں لی اور اس کے ساتھ ہی تدریس کے شعبے میں آگئے عملی زندگی کا آغاز سینٹ جان کالج آگرہ سے کیا جہاں وہ اردو زبان و ادب کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ 1983ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں آگئے اور ترقی کے مدارج طے کرتے کرتے 2003ء میں پروفیسر کے عہدے تک پہنچ گئے۔ اس مقام پر ان کے فیض عام کا دائرہ وسیع ہو گیا اور الہ آباد یونیورسٹی کے طلباء اور طالبات ان سے بے دریغ استفادہ کرنے لگے۔ ان کے طلباء اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا کلاس روم لیکچر معلومات کا خزینہ ہوتا ہے۔ وہ لیکچر کے دوران اس روز کے

موضوع تک محدود نہیں رہتے بلکہ اسی موضوع کے گرد و پیش کو بھی روشن کرتے جاتے ہیں اور اس موضوع سے متعلقہ نہ صرف کتابوں سے متعارف کراتے ہیں بلکہ ان کتابوں کے مصنفین کے نام اور کام سے بھی شناسائی عطا کرتے چلے جاتے ہیں۔ بلا شبہ علی احمد فاطمی یونیورسٹی کے استاد ہیں اور اپنے فرائض منصبی پوری ذمہ داری سے انجام دیتے ہیں لیکن ان کی کتابیں دیکھیں تو وہ مجھے کل وقتی مصنف نظر آتے ہیں۔ اب میں ذہن پر زور بھی ڈالوں تو مجھے ان کی کتابوں...... ''تاریخی ناول''...... ''نظیر اکبر آبادی''...... ''عبدالحلیم شرر''...... ''فراق گورکھ پوری''...... ''نئی تنقید نئی اقدار''...... ''سات سمندر پار''...... ''سفر ہے شرط''...... ''بیس نئی کہانیاں''...... ''تین ترقی پسند شاعر''...... ''جوش ملیح آبادی نئے تناظر میں''...... اور ''ترقی پسند تحریک سفر در سفر'' یاد آرہی ہیں۔ مجھے یہ نام اس لئے یاد ہو گئے ہیں کہ میں کتابوں کا ناشر ہی نہیں ان کا تقسیم کار بھی ہوں۔ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلباء کو اپنے تحقیقی موضوع پر کتابوں کی تلاش ہوتی ہے تو وہ مقبول اکیڈمی کا رخ کرتے ہیں۔ اور مجھے ان کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتابوں کی فہرست دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ انہیں سب سے زیادہ علی احمد فاطمی صاحب کی کتابوں کی تلاش ہوتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے بارے میں صرف ان کی کتابیں ''اپ ٹو ڈیٹ'' ہیں۔ میں نے ایک طالبہ کو خلیل الرحمان اعظمی کی ترقی پسند تحریک کے بارے میں لکھی گئی کتاب پڑھنے کا مشورہ دیا تو اس نے جواب دیا۔ ''وہ کتاب اب پرانی ہو گئی ہے'' بلکہ اب عزیز احمد کی کتاب بھی طلباء کے لئے مفید نہیں رہی۔ علی احمد فاطمی کی کتابیں جدید دور کے سوالات کا مدلل جواب پیش کرتی ہیں۔ طلباء کی اس دلچسپی نے ہی مجھے فاطمی صاحب کے قریب کر دیا اور خط و کتابت ہوئی تو ان کی شخصیت کا روشن نقش میرے دل پر نقش ہو گیا۔

پروفیسر فاطمی دس سال تک ترقی پسند تحریک کا نمائندہ رسالہ ''نیا سفر'' کی ادارت بھی کرتے رہے ہیں۔ اس رسالے کو انہوں نے صرف تحریکی ادب یا تحریک سے وابستہ ادیبوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ یہ بحث اور مباحثہ کا کھلا میدان تھا۔ جہاں ہند و پاک کے ادیب آپس میں ہر موضوع پر گفتگو کر سکتے تھے۔ ایک اچھے مدیر کی طرح فاطمی صاحب نے

لکھنے والوں پر کبھی پابندی نہیں لگائی بلکہ کون لکھ رہا ہے'' کی بجائے ہمیشہ یہ دیکھا کہ ''کیا لکھا گیا ہے''...... یہ خوبی بہت سے ادبی رسائل کے مدیران میں مجھے نظر نہیں آتی۔

علی احمد فاطمی صاحب کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے عالمی مذاکروں میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ 1985ء میں ترقی پسند تحریک کی گولڈن جوبلی لندن میں منائی گئی تو علی احمد فاطمی نے اس میں شرکت کی اور کانفرنس کے شرکاء کو اپنے خیالات سے آگہی عطا کی۔ لندن ہی میں انہوں نے جوش سیمینار میں 1998ء میں ایک خیال انگیز مقالہ پڑھا اور تاشقند میں ''غالب کی یاد'' میں سیمینار میں بھی شامل ہوئے۔ فاطمی صاحب ادبی سیمیناروں میں کینیڈا کا سفر بھی کر چکے ہیں۔ ان جلسوں میں انہیں کئی ایوارڈز پیش کئے گئے۔ وہ اقبال اکیڈمی کے صدر اور جوش و فراق لٹریری سوسائٹی کے جنرل سیکرٹری ہیں۔ علی احمد فاطمی پاکستان کا دورہ کر چکے ہیں۔ لیکن لاہور نہیں آئے۔ اس لئے مجھے ان سے ملاقات کا موقع نہیں مل سکا۔ لیکن میں نے ان کی کتابیں پڑھیں تو وہ مجھے اپنے دل کے بہت قریب محسوس ہوئے۔ خط و کتابت میں بھی ان کی کشادہ نظری متاثر کرتی ہے۔ وہ اختلاف کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہیں اور غلط ہائے مضامین پر برہم ہونے کی بجائے اپنے جواب سادہ اور دل نشین انداز میں اس طرح دیتے ہیں کہ ان کا مخالف بھی ان کی عزت و تکریم پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ان کے اندر کا سچا انسان صرف علم کا جویا ہے۔ اور میں کہہ سکتا ہوں کہ پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنا زندگی کا ایک ایک لمحہ تلاش و جستجو میں صرف کیا ہے اور اب ہندوستان کے نامور مصنفین میں شمار ہوتے ہیں۔ ''سفر جاری ہے'' پر ان کا مقالہ ان کی کشادہ نظری اور مقبول نوازی کی زریں مثال ہے میں انہیں غائبانہ سلام پیش کرتا ہوں۔

..........☆☆..........
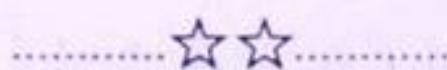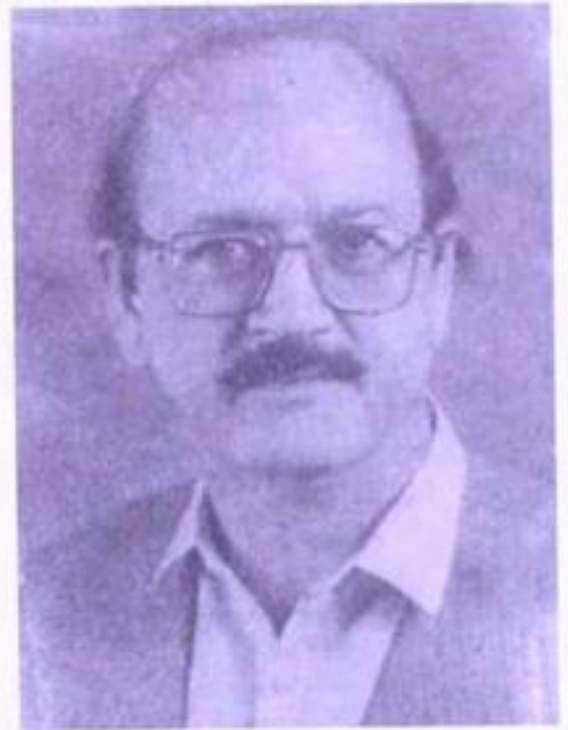
ڈاکٹر علی محمد خان

ڈاکٹر علی محمد خان کو میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ ضرور عالم فاضل آدمی ہیں اور کسی بڑے کالج میں یا پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسر ہوں گے۔ ان سے بات چیت شروع ہوئی تو واقعی احساس ہوا کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی علم کی تلاش میں صرف کی ہے اور یونیورسٹی تعلیم مکمل کرنے اور محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کرنے کے بعد بھی علم کی پیاس نہ بجھی تو پی ایچ ڈی کرنے لگے۔ انہوں نے دو ایم اے کیے۔ ایک اردو میں اور دوسرا تاریخ میں۔ لیکن انہیں اردو سے محبت زیادہ تھی۔ اس لئے پی ایچ ڈی کا مقالہ ''لاہور کا دبستان شاعری'' کے عنوان سے اردو میں لکھا لیکن اس میں تاریخ سے پورا پورا استفادہ کیا۔ یاد رہے کہ اس مقالے کے نگران ڈاکٹر سجاد باقر رضوی تھے۔ جو یہ مقالہ تکمیل تک پہنچانے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ لیکن ڈاکٹر علی محمد خان نے ان کے نام کو زندہ رکھا اور ان کی شاگردی پر ہمیشہ فخر کا اظہار کیا۔

ڈاکٹر علی محمد خان کی پیدائش 7 ستمبر 1941ء کو مولانا الطاف حسین حالی کی پیدائش کے شہر پانی پت میں ہوئی۔ اس شہر کی فضا میں مولانا حالی کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ مولانا حالی کی شخصیت کی خوشبو کو ڈاکٹر علی محمد خان نے بھی قبول کیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اندر سے اپنی ''خان صاحبی'' کو کبھی سطح پر ابھرنے نہیں دیا اور حالی جیسی شرافت ان کے چہرے سے بھی

عیاں ہوتی ہے۔ ایک دوست کہنے لگے کہ ڈاکٹر علی محمد خان نے عینک تو پہن ہی رکھی ہے۔ اب اگر داڑھی بڑھا لیں سر پر ٹوپی اور گلے میں مفلر ڈال لیں تو وہ حالیؔ ہی نظر آئیں گے اور انہیں یہ نہیں بتانا پڑے گا کہ وہ ''پانی پت'' میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے قالب میں الطاف حسین حالیؔ کی روح سمائی ہوئی ہے۔

قیام پاکستان کے وقت علی محمد خان کی عمر صرف 6 سال کی تھی لیکن وہ پانی پت کی گلیوں میں ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے لگاتے لگاتے آخر پاکستان حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اپنے پیدائشی وطن کو چھوڑ کر پاکستان آ گئے۔ جوان کے بچپن کے خوابوں کا وطن تھا۔ ان کا پہلا قیام سیالکوٹ کے شہر ڈسکہ کے نواحی گاؤں مترانوالی میں تھا۔ ان کے بزرگوں کو یہاں تھوڑی سی زمین الاٹ ہو گئی اور انہوں نے مترانوالی کو ہی وطن بنا لیا۔ علی محمد خان نے کالج کی انٹر تک تعلیم گوجرانوالہ میں حاصل کی اور اپنی زندگی خود بنانے کے لئے معلمی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ لیکن تعلیم حاصل کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ انہوں نے ایم اے اردو اور تاریخ کے امتحان پرائیوٹ طالب علم کی حیثیت میں پاس کئے۔ پہلی ملازمت 1961ء میں ایس وی ٹیچر کی حیثیت میں کی لیکن 1973ء میں وہ اردو کے لیکچرار مقرر ہو گئے اور 2001ء میں ریٹائر ہوئے تو ایسوسی ایٹ پروفیسر بن چکے تھے۔ ان کا افتخار یہ ہے کہ انہوں نے ایک محتاط اندازے کے مطابق 80 ہزار شاگردوں کو ادب کی تعلیم دی ہے۔ اور تدریس ان کا پیشہ نہیں، بلکہ شوق ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کو طلباء کی شخصیت سازی میں گہری دلچسپی ہے اور اس کی صلاحیت انہوں نے اپنے اساتذہ مولوی عبدالغنی اور ماسٹر نور محمد سے حاصل کی تھی جو مدرسے سے باہر بھی طلباء کے کردار اور ان کی عادات و فصائل پر نظر رکھتے تھے۔ اس طرح علی محمد خان نے بھی اپنے طالب علموں کو زندگی کی مشکل راہوں میں کبھی بھٹکنے نہ دیا۔

ڈاکٹر علی محمد خان نے تدریسی زندگی کا لمبا عرصہ لاہور سائنس کالج میں گزارا جو وحدت روڈ پر واقع ہے۔ یہاں ان کے معاصر اساتذہ میں حسن عسکری کاظمی، جعفر بلوچ،

عبدالغنی فاروق، قاری سرفراز حسین فاروقی، افتخار احمد باجوہ، سید عمر فیض اور ڈاکٹر اعجاز بٹ جیسے لوگ شامل تھے۔ جو علم میں یکتا اور کردار میں مثالی مقام رکھتے تھے۔

انہیں سجاد باقر رضوی کی شخصیت نے سب سے زیادہ متاثر کیا اور ان کا افتخار یہ ہے کہ وہ رضوی صاحب کے پہلے اور آخری شاگرد تھے جس نے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لئے ان سے فیض اٹھایا تھا۔ سجاد باقر رضوی نے وفات پائی تو ڈاکٹر علی محمد خان افسردہ وملول ہو گئے۔ ان کی رائے میں یہ ملک اچھے اور مثالی انسانوں سے خالی ہوتا جا رہا تھا۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی اور نئی روشنی پیدا نہیں ہو رہی تھی۔

ڈاکٹر علی محمد خان متعدد درسی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی تالیف کی ہوئی کتابیں پنجاب کے سکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ انہیں سب سے زیادہ شہرت ان کی کتاب ''لاہور کا دبستانِ شاعری'' سے ملی۔ اب یہ کتاب پی ایچ ڈی کے طلباء حوالے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے کیمبرج اور لندن یونیورسٹی کے ''اے لیول'' کے لئے اردو کی کتابیں تالیف کی ہیں جن سے ملکی اور غیر ملکی طلباء استفادہ کرتے ہیں۔ ان کتابوں میں انہوں نے امراؤ جان ادا اور مراۃ العروس سے اقتباسات دیئے ہیں۔ غالب اور اقبال کی غزلوں کے علاوہ اردو کے چھ منتخب افسانے بھی شامل کئے ہیں۔ جدید نظموں اور غزلوں کا انتخاب بڑی خورد بینی سے کیا ہے۔

ڈاکٹر علی محمد خان خلوص کا پیکر ہیں۔ ان کے قول اور فعل میں تضاد نہیں۔ ان کا ظاہر ہی ان کا باطن ہے۔ سرکاری ملازمت سے فارغ ہوئے تو ان کی خدمات ایف سی کالج یونیورسٹی نے حاصل کر لیں۔ اور یہاں انہوں نے شعبہ اردو کو استوار کیا۔ ڈاکٹر صاحب ہفتہ دس دن کے بعد اپنی یونیورسٹی سے ٹیلی فون کرتے ہیں تو سب سے پہلے پوچھتے ہیں کہ مقبول اکیڈمی کی نئی کتابیں کون سی آئی ہیں۔ میری کتاب ''سفر جاری ہے'' پر انہوں نے میری جو حوصلہ افزائی کی وہ میرا امتیاز ہے۔ اللہ ان کو خوش رکھے۔

☆☆

عمران نقوی

عمران نقوی کو میں ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی کے حوالے سے جانتا ہوں۔ اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ عمران نقوی ان کے ساتھ ہی مقبول اکیڈمی پر آئے تھے۔ آفتاب نقوی جنہیں شاہدرہ کی جی ٹی روڈ پر دن دہاڑے شقی القلب دہشت گردوں نے اس وقت گولی کا نشانہ بنا دیا جب وہ اپنے کالج کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اس وقت آفتاب احمد نقوی علم و ادب دنیا میں اپنا نام اور مقام قائم کر چکے تھے۔ نعت نگاری میں ان کی عقیدت نئے نئے زاویوں سے ظاہر ہوتی تھی۔ اور انہوں نے اپنے کالج کے ادبی رسالہ کا ضخیم ''نعت نمبر'' بھی شائع کیا تھا جو اب حوالے کے طور پر کام آتا ہے۔ عمران نقوی کی ادبی تربیت ان کے بڑے بھائی نے ہی کی تھی۔ اور نوجوانی کے آغاز میں ہی عمران نقوی کو کتابیں پڑھنے اور لائبریری بنانے کی چاٹ لگا دی تھی۔ چنانچہ آفتاب نقوی صاحب کی وفات کے بعد عمران نقوی کا مقبول اکیڈمی پر آنا جانا زیادہ ہو گیا اور پھر دوستی مضبوط ہوتی چلی گئی۔

عمران نقوی کا بچپن سانگلہ ہل کے نواحی گاؤں میں بسر ہوا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم بھی اس پسماندہ گاؤں کے معمولی مدرسوں میں حاصل کی۔ لیکن جب ان کے گاؤں کے سکول کا ذکر آتا تو عمران نقوی اپنے پرائمری درجے کے استادوں کا ذکر بڑی محبت اور عقیدت سے کرتے اور کہتے کہ گاؤں کا یہ مدرسہ بڑے شہروں کے اعلیٰ پائے کے سکولوں سے

بہتر تھا۔ کیوں کہ یہاں استاد طالب علم کی عادت و خصائل اور چال چلن پر بھی نظر رکھتے تھے۔ اور غلط کام کرنے پر سزا بھی ملتی تھی۔ جس پر لڑکے کے ماں باپ بالکل اعتراض نہیں کرتے تھے ان کا کہنا تھا کہ ہمیں اپنے ماں باپ اور بڑے بہن بھائیوں سے ڈر نہیں لگتا تھا لیکن اپنے استاد کے حکم کی تعمیل کا ہر وقت خیال رہتا تھا اور سبق یاد نہ کرنے پر جو مار پڑتی تھی وہ بھی یاد رہتی تھی۔ عمران نقوی نے کہا کہ انہیں اپنے اُستاد کی مار بھی یاد ہے لیکن میں ان کا ذکر اس لئے عقیدت سے کرتا ہوں کہ انہوں نے اچھی عادات بنانے میں اور شخصیت سازی میں بڑی محبت کا ثبوت دیا۔ اور وہ ہمارے لئے ماں باپ کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ قابل عزت تھے اور ہمیشہ رہیں گے۔ 1976ء کے لگ بھگ عمران نقوی کا خاندان لاہور منتقل ہو گیا اور یہاں انہوں نے مستقل رہائش کے لئے شاہدرہ کے ایک محلے میں اپنا مکان تعمیر کر لیا۔ انہوں نے کالج کی تعلیم بی اے تک حاصل کی۔ اس دوران انہیں کالج کے ادبی رسالے کا مدیر بنا دیا۔ صحافت کی طرف ان کا یہ پہلا قدم تھا۔ ادبی صحافت میں بھی ان کے رہنما ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی تھے جو لاہور کے تمام ادبی حلقوں میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ عمران نقوی کو بھی ادبی حلقوں میں انہوں نے ہی متعارف کرایا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ آفتاب نقوی صاحب نے عمران نقوی کو سمجھایا کہ اردو ہماری قومی زبان ہے۔ اس کے حقوق کی نوعیت جداگانہ ہے۔ لیکن پنجابی ہماری ماں بولی ہے۔ جو اگرچہ تحریر کی زبان نہیں بنی لیکن رسم الخط میں اب پنجابی ادب کو بھی فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ اور ماں بولی کی خدمت قومی زبان کی طرح ضروری ہے۔ عمران نقوی نے اپنے بڑے بھائی کی اس نصیحت کو پلے باندھ لیا اور پانچ سال تک ''پنجابی ادبی پردار'' کے سیکرٹری کی خدمات انجام دیں اس دور میں ہی ان کی پنجابی شاعری کو بھی فروغ حاصل ہوا۔

عمران نقوی نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ریڈیو پاکستان لاہور سے کیا۔ وہ اس ادارے کے ساتھ ''اناؤنسر'' کی حیثیت میں وابستہ ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے پنجابی کے کئی مقبول پروگرام بھی ترتیب دیئے اور پنجابی کے ادیبوں کو خاص طور پر لاہور ریڈیو سے

متعارف کرایا۔ وہ بالعموم دور دور کے دیہاتوں سے پنجابی کے شاعروں کو بلواتے اور ان کی شاعری نہ صرف ان کی زبان سے ریڈیو کے سامعین کو سنواتے بلکہ ان کی پنجابی شاعری کی طرف موسیقاروں کو بھی متوجہ کراتے اور ان کے نغمے ریڈیو سے نشر کراوتے۔ عمران نقوی کی اس خدمت کا اعتراف اس دور کے سب لوگوں نے کیا ہے۔

عمران نقوی کے حقیقی ادبی جوہر اس وقت کھلے جب انہوں نے ملک کے ممتاز نظریاتی اخبار ''نوائے وقت'' میں ملازمت حاصل کر لی۔ لیکن ان کی توجہ ''رپورٹنگ'' کے شعبے نے حاصل نہ کی۔ بلکہ یہاں بھی انہوں نے ''ادبی صحافت'' کو ہی اہمیت دی۔ ''نوائے وقت'' کے ایڈیٹر انچیف جناب مجید نظامی نے عمران نقوی کے ادبی جوہر کو پہنچان لیا اور انہیں ''ادبی ایڈیشن'' کا انچارج مقرر کر دیا۔

اب یہاں اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ اس وقت لاہور کے اخبارات میں سے ''امروز''، ''جنگ'' اور ''مشرق'' کے ادبی ایڈیشن بہت مقبول تھے۔ عمران نقوی نے 'نوائے وقت' ادبی ایڈیشن کا چارج سنبھالا تو اس کی کایا پلٹ دی۔ انہوں نے متذکرہ تینوں اخبارات کے چیلنج کو قبول کیا اور ''نوائے وقت'' کے نظریاتی مزاج کو قائم رکھتے ہوئے ادبی صفحہ مرتب کرنا شروع کیا تو اس کی دھوم پورے ملک میں مچ گئی۔ انہوں نے سب سے زیادہ ادبی مباحث کو اہمیت دی دوسری خوبی ادیبوں کے انٹرویوز تھے، تیری خوبی ادبی خبروں اور تبصروں کی اشاعت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ''نوائے وقت'' کے ادبی صفحے کا جو ہر ہفتے شائع ہوتا تھا ماہانہ ادبی رسائل بھی نہ کر سکے۔ عمران نقوی نے ادب اور خبر کے ساتھ ادیب کی تصویر کو بھی اہمیت دی اور مذاکروں کا انتظام بھی کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ''نوائے وقت'' کی ادبی خدمات کو عمران نقوی نے چار چاند لگا دیئے اور اس کا طویل دور ''ادبی صفحے'' کا سنہری دور ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کی رائے میں ''عمران نقوی توسیع ذات کی خواہش سے بے نیاز ہیں''۔

''نوائے وقت'' میں ہی عمران نقوی کی اردو اور پنجابی شاعری کے ساتھ اس کی خاکہ نگاری اور ملاقات نگاری بھی پروان چڑھی، کتابیں مرتب کرنے اور چھپوانے کا ذوق بھی روز افزوں ہوا۔ عمران نقوی کی شاعری اور نعت کی کتابیں چھپ چکی ہے۔ انٹرویوز کے بھی

کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں ان کی نعت کی ایک کتاب پر ''سیرت ایوارڈ'' دیا گیا ہے قومی سطح کا ہے اردو اور پنجابی کے اس ادیب اور شاعر صحافی کے لئے میں دعائے خیر کرتا ہوں خدا ان کی ترقی کے دروازے کھلے رکھے۔

☆☆

عمرانہ مشتاق

محترمہ عمرانہ مشتاق خاموش بیٹھی ہوں تو مونالیزا کی تصویر نظر آتی ہیں۔ ادبی محفل میں بولنے لگیں تو یہ ادبی محفل سقراط کی اکیڈمی بن جاتی اور سب لوگ عمرانہ مشتاق کے منہ سے دانش کے پھول جھڑتے دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتے۔ حیرت کی ایک بات یہ بھی تھی کہ ان کے والد سید مشتاق حسین محکمہ پولیس میں ڈی ایس پی تھے۔ اور محترمہ عمرانہ مشتاق ناراض نہ ہوں تو عرض کردوں کہ پولیس کا محکمہ ایسا ہے کہ اس کا مجرموں کے تعاقب میں عمل پولیس افسر کے چہرے پر ثبت ہوتا جاتا ہے۔ پولیس کا اہلکار سفید کپڑوں میں بھی ہو تو ہجوم میں پہچانا جاتا ہے کہ وہ پولسیا ہے اور اس کے اثرات اولاد کے چہرے پر بھی ابھر آتے ہیں۔ لیکن محترمہ عمرانہ سے جنہوں نے اپنے نام کے ساتھ اپنے والد صاحب کے نام کی نسبت قائم رکھی کے چہرے پر شانتی ہی شانتی ہے۔ سکون ہی سکون ہے۔ اور یہ پر سکون چہرہ ان کے والد صاحب کی دین نظر آتا ہے۔ ان کے ادبی ذوق کی طرف آئیں تو مجھے یقین ہے کہ یہ انہیں اپنی والدہ محترمہ سے ملا ہے۔ بلاشبہ ان کی والدہ محترمہ سکینہ فرحت ایک خانہ دار خاتون تھیں۔ لیکن انہوں نے قرآنِ کریم حفظ کیا تھا۔ تعلیم کچھ مدرسے سے حاصل کی اور اس میں اضافہ خود کیا۔ وہ شاعرہ بھی تھیں۔ چنانچہ یہ تمام خوبیاں انہوں نے اپنی بیٹی کی پرورش کے دوران عمرانہ کو منتقل کر دیں اور عمرانہ صاحبہ کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ادب و شعر کی صفات کو نہ صرف قبول کیا بلکہ کالج

اور یونیورسٹی کی تعلیم میں ان میں مسلسل اضافہ بھی کیا اور اپنا تعلیمی ریکارڈ شاندار انداز میں قائم کیا۔ اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے زمینی حقائق معلوم کرنے میں دلچسپی لی تو ایم اے ''جغرافیہ'' کے مضمون میں کیا جسے بالعموم لڑکیاں پسند نہیں کرتیں۔ محکمہ تعلیم میں شرکت اختیار کی تو پرنسپل کے عہدے تک پہنچ کر ریٹائرمنٹ لے لی۔ ان کی زندگی کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ ان کے والدین نے ان کی شادی کی تو ان کے لئے شوہر بھی ایسا منتخب کیا جو ان کی ادبی اور علمی صلاحیتوں کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کر سکے یہ ڈاکٹر سید غلام احمد تھے جو علامہ اقبال میڈیکل کالج کے وائس پرنسپل تھے۔ ادھر محترمہ عمرانہ مشتاق نے اپنی ایم اے کی ڈگری پر قناعت نہیں کی بلکہ پنجاب یونیورسٹی میں ایم فل کا سلسلہ شروع ہوا تو یہ امتحان بھی پاس کر لیا اور پھر پی ایچ ڈی کی تیاری میں مصروف ہو گئیں۔ لیکن کالج سے ریٹائرمنٹ لی تو ان کے دل میں قوم کی سیاسی تہذیبی اور سماجی زندگی سنوارنے کا خیال پیدا ہو گیا اور انہوں نے صحافت کا شعبہ اختیار کر لیا۔ ان کا تعلق اخبار ''سماء'' کے ساتھ تھا اور وہ اس کی چیف ایڈیٹر تھیں۔ اردو میں کسی بڑے اخبار کی پہلی خاتون ایڈیٹر ہونے کا اعزاز محترمہ عمرانہ مشتاق کو حاصل ہے جو اس سے قبل اخبار ''اوصاف'' اور ''نوائے وقت'' میں کالم نگاری اختیار کر کے اپنے اس اعتماد کو بحال کر چکی تھیں کہ وہ بڑے پیمانے پر قوم کی راہنمائی کر سکتی ہیں۔ ان کی صحافتی خوبیوں کا چرچا ہوا تو کئی رسائل نے انہیں اپنا ایگزیکٹو ایڈیٹر بنا لیا۔ ان میں رسالہ ''اولمپک'' اور 'بدلتا عالم' کے نام مجھے یاد آ رہے ہیں۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جب منیر نیازی عمر کی آخری منزل میں تھے اور گوناگوں بیماریوں کا شکار تھے تو عمرانہ مشتاق نے ان کی تیمارداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ منیر نیازی کی اولاد نہیں تھی۔ اور ان کو بیماری کی حالت میں سنبھالنا اکیلے ان کی بیگم کے بس میں نہیں تھا۔ اس موقعہ پر عمرانہ مشتاق نے ان کا ہاتھ بٹایا۔ منیر نیازی نے بھی عمرانہ مشتاق کو بیٹی کا پیار دیا۔ ان کی وفات کے بعد عمرانہ مشتاق نے منیر نیازی پر اپنی یادوں پر مشتمل پہلی کتاب لکھی جو اپنی مثال آپ ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا مسئلہ درپیش ہوا تو عمرانہ مشتاق

نے جناب اظہر جاوید سے راہنمائی طلب کی۔ اظہر جاوید انہیں لے کر مقبول اکیڈمی آئے اور کہا ''منیر نیازی پر عمرانہ مشتاق کی کتاب مقبول اکیڈمی سے چھپے گی'' میں نے ان دونوں کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ اب یہ کتاب چھپ چکی ہے اور پورے ملک میں عمرانہ مشتاق کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں منیر نیازی کے آخری دنوں کی پوری داستان بڑے خلوص سے رقم کی ہے۔

عمرانہ مشتاق ذہنی طور پر اصلاح پسند خاتون ہیں۔ وہ حب وطن کے جذبے سے سرشار اور پاکستان کے استحکام اور ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔ شاعری ان کا پیشہ نہیں شوق ہے۔ اپنی شاعری میں انہوں نے غزل کی آبیاری جدید انداز میں کی ہے اور نظم میں قومی مسائل اور اپنے جذبوں کا اظہار کیا ہے ان کی شاعری کی دو کتابیں ''ہجر کا عذاب'' اور ''اماوس'' چھپ چکی ہیں۔ ایک روز اچانک انہیں رب کعبہ کا بلاوا آ گیا۔ انہوں نے رخت سفر باندھا اور حج کی سعادت سے فیضیاب ہو آئیں۔ اب حج کے تاثرات پر کتاب لکھ رہی ہیں جو سفر نامہ بھی ہوگا اور روح کے سفر کی داستان بھی۔ خدا زور قلم زیادہ کرے۔ میرا زندگی نامہ ''سفر جاری ہے'' کو انہوں نے ''پورا سچ/تخلیقی سفر'' کا عنوان دیا ہے۔

☆☆
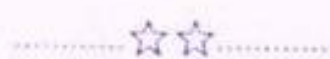
ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر

آپ ضرور حیران ہوں گے کہ محترمہ ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر سے رسمی تعارف نہ ہونے کے باوجود میں ان کا غائبانہ مداح ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی ادیب سے رسمی اور وجودی تعارف ضروری نہیں ہوتا۔ بلکہ جس طرح اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کے فیصلے بولتے ہیں، اسی طرح کسی ادیب کی تحریریں بھی اس کا پورا تعارف کرادیتی ہیں اور ان کی شخصیت کا جادوان کی تحریروں سے قاری کو اپنے اثر میں لے لیتا ہے۔ میں یہاں مثال محترمہ ادا جعفری کی پیش کروں گا۔ ان کی نظمیں اور غزلیں میں اس دور سے پڑھ رہا تھا جب وہ ادا بدایونی کے نام سے لکھ رہی تھیں اور ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کو پڑھ کر احترام کا جذبہ میرے دل میں پیدا ہو گیا اور جب میں کراچی میں اپنے ادارہ مقبول اکیڈمی کے لئے ان کی نئی کتاب حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوا تو وہ مجھے اپنی تحریروں کے عین مطابق نظر آئیں۔ محترمہ ڈاکٹر عنبرین شاکر کی کیفیت بھی ایسے ہی سمجھئے۔ ان کا نام میرے سامنے سب سے پہلے ڈاکٹر رشید امجد نے لیا تھا جو نمل یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے سربراہ تھے اور محترمہ عنبرین تبسم شاکر ڈاکٹر عابد سیال کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہی تھیں۔ اب مجھے یاد آرہا ہے کہ ایک مرتبہ پروفیسر جمیل آذر نے بھی ان کا ذکر ٹیلی فون پر کیا تھا اور مجھے بتایا تھا کہ

محترمہ عنبرین تبسم شاکر ان کی انشائیہ نگاری پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں ایم فل کی ڈگری کے لیے مقالہ لکھ رہی ہیں۔ یہ مقالہ انہوں نے ڈاکٹر رشید امجد کی نگرانی میں لکھا تھا۔ بعد میں پروفیسر جمیل آذر صاحب نے مجھے شاہ عبداللطیف بھٹائی یونیورسٹی (خیر پور) کا رسالہ 'الماس'' مرحت فرمایا تو اس میں محترمہ ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر کا مقالہ۔ انشائیہ اور انفرادی سوچ...... ایک تجزیاتی مطالعہ چھپا ہوا تھا۔ میں نے پروفیسر جمیل آذر صاحب کو ٹیلی فون پر مبارکباد دی کہ ایسا خوبصورت مقالہ تو اکبر حمیدی صاحب یا انجم نیازی صاحب بھی شاید نہ لکھ سکیں جو خود انشائیہ نگار ہیں۔ اب میں نے مناسب سمجھا کہ انہیں اپنی کتاب ''سفر جاری ہے'' پیش کروں۔ اس کتاب کی رسید انہوں نے اپنے قلم سے خط لکھ کر عنایت فرمائی اور یہ خط ان کی تہذیبی، ادبی، علمی اور نسوانی شائستگی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔

اب مجھے ان کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کا خیال آیا تو پروفیسر جمیل آذر صاحب نے بتایا کہ محترمہ عنبرین تبسم شاکر اردو ادب کی بے حد سنجیدہ قاری ہیں۔ وہ صرف کتاب نہیں پڑھتیں بلکہ کتاب کے متن کے عقب سے لکھنے والے کی شخصیت کو بھی تلاش کرتی ہیں۔ وہ پڑھتی زیادہ ہیں۔ لیکن لکھتی کم ہیں۔ اب تک ان کے تین چار مضامین ہی شائع ہوئے ہیں مثلاً ان کا مقالہ ''شرق شناسی کیا ہے؟ ایک نئے موضوع پر نئے زاویہ نظر کا مقالہ ہے اور ''مشرق'' کے مزاج کو داخلی زاویوں سے سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ انہوں نے ضیاء جعفری مرحوم کو گم شدہ ماضی سے دریافت کیا اور ملال کیا کہ اردو دان طبقے نے ''ادب کے اس نقش گر'' کو بھلا دیا ہے۔ یہ مقالہ لکھ کر انہوں نے پشاور کے گرد و نواح ضیا جعفری صاحب کی ادبی خدمات کی تجدید کی اور اردو پر ان کے احسانات کا جائزہ لیا ہے۔ ان کا ایک اور گرامی قدر مقالہ ''اردو ادب پر تحریک آزادی اور جمہوری بیداری کے اثرات'' ...... تحریک آزادی کے اثرات کو تو ڈاکٹر معین الدین عقیل اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اپنی کتابوں میں پیش کر چکے ہیں۔ لیکن ''جمہوری بیداری''

کے اثرات پر پہلی مرتبہ محترمہ ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر نے قلم اٹھایا ہے اور سچ یہ ہے کہ اس موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔

محترمہ ڈاکٹر عنبرین نے 1991ء میں پشاور بورڈ سے میٹرک کا امتحان سائنس کے مضامین کے ساتھ پاس کیا تھا۔ لیکن ان کا رجحان ادب کی طرف زیادہ تھا چنانچہ 2005ء میں پشاور یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان اردو کے مضمون میں کیا اور فرسٹ کلاس حاصل کی۔ پشاور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے اساتذہ نے ان کے دل میں اردو ادب کی ایسی محبت پیدا کر دی کہ بعد میں انہوں نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی اردو میں تحقیقی مقالات لکھ کر حاصل کی۔ اور تدریس کے لیے بھی اردو کا شعبہ ہی اختیار کیا۔ محترمہ ڈاکٹر عنبرین شاکر اس وقت نمل یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی استاد ہیں اور بہت سے طلبا اور طالبات ان کے علم و دانش سے استفادہ کرتے ہیں۔ انہیں نمل یونیورسٹی کی ہر دل عزیز استاد کا درجہ حاصل ہے اور طلباء ان کی غیر حاضری میں ان کی بہت تعریف کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عنبرین تبسم کی دلچسپیاں محض کتابی نہیں۔ بلکہ وہ پشاور ٹیلی ویژن پر ''ہندکو'' کے پروگرام ''سوغات'' کی میزبانی بھی کرتی رہی ہیں۔ اس پروگرام کا سکرپٹ بھی وہ خود ہی لکھتی تھیں۔ صوبہ خیبر پختون خوا کے علاوہ پنجاب اور سندھ اور بلوچستان میں بھی یہ پروگرام بڑی دلچسپی سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ریڈیو پشاور کے پروگرام ''بزم خواتین'' کو بھی آراستہ کیا اور خانۂ فرہنگ کی ادبی و تہذیبی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔

ڈاکٹر عنبرین تبسم صاحبہ سپریم کورٹ کے جج جسٹس شاکر اللہ جان کی بیگم ہیں۔ لیکن ان کی سادہ مزاجی، شائستگی، وضعداری کا اپنا ایک انداز ہے۔ یونیورسٹی میں وہ صرف ادب کی استاد نظر آتی ہیں۔ اور ان سے ملنے والوں کا خیال ہے کہ وہ گھر میں بھی عام خاتون کی وضعداری اوڑھے رکھتی ہیں اور سپریم کورٹ کے جج کی بیگم ہونے کا احساس کسی کو نہیں

ہونے دیتیں۔ ان سے غیر متعارف ہونے کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ میں ان سے پوری طرح متعارف ہوں۔ اوراس لیے میں نے ان کی شخصیت پر قلم اٹھانے کی جسارت کرلی ہے۔ مقبول اکیڈمی کووہ جس محبت کی نظر سے دیکھتی اوراس کی کتابوں پراپنی رائے دیتی ہیں وہ میرا حقیقی اعزاز ہیں۔

☆☆
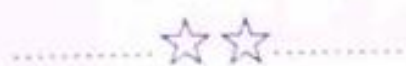
غلام نبی اعوان

میجر (ر) غلام نبی اعوان سے ملیں تو سب سے پہلے ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی طمانیت کی روشنی متاثر کرتی ہے پھر وہ اپنے نفس مطمئنہ کا ذکر کرتے ہیں تو خدا کا شکر بجالاتے ہیں کہ انہوں نے کبھی کسی سرمایہ دار کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا اور ہمیشہ اپنی قوت بازو پر بھروسہ کیا اور محنت کر کے رزق حلال کمایا۔ بچپن کا زمانہ یاد آجائے تو بلا تامل بتا دیتے ہیں کہ وہ اپنے منہ میں سونے کا چمچہ تو کیا کانسی یا پیتل کا چمچہ بھی لے کر پیدا نہیں ہوئے، وہ بتاتے ہیں کہ:۔

''والد صاحب ریاست بہاولپور کی تحصیل صادق آباد میں میر منشی تھے، گھر میں کھانا اچھا پکتا تھا۔ اڑوس پڑوس کی خانہ دار عورتیں ان کے گھر سے پلیٹیں بھر بھر کے کھانا لے جاتی تھیں، پہننے کے لئے اچھے کپڑے بھی مل جاتے تھے۔ والد صاحب کی سفید پوشی میں ایک شان تھی جس میں ان کے بچے بھی حصہ دار تھے''۔

پھر ریاست بہاولپور کا الحاق پاکستان سے کر دیا گیا۔ ریاستی باشندوں کے لئے یہ الحاق سودمند نہ ہوا۔ کھاتے پیتے گھرانے غربت اور افلاس کی لپیٹ میں آگئے ان میں غلام نبی اعوان کا خاندان بھی تھا لیکن والدین کی مفلسی سے باخبر غلام نبی اعوان علم کی دولت سمیٹتے رہے تھے۔ مڈل کا نتیجہ آیا تو وہ ریاست کے تمام سکولوں میں اول آئے تھے

لیکن المیہ دیکھئے کہ والد صاحب نے انہیں ایک گھڑی ساز کے پاس بٹھا دیا تھا کہ رزق حلال حاصل کرنے کا ہنر سیکھ جائیں۔ ریاست میں فرسٹ آنے پر ان کے استاد گھڑی ساز نے دستگیری کی اور ان کے والد کو آمادہ کر لیا کہ غلام نبی تعلیم جاری رکھیں۔

اب ان کے ذوق شوق کے پر نکلنے لگے۔ ہائی سکول کی غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی شرکت کرنے لگے۔ بہاولپور کے اخبارات اور رسائل میں مضامین لکھنے لگے مضمون چھپ کر آتا تو خوشی سے پھولے نہ سماتے اور اسے پکی سیاہی سے چھپا ہوا دیکھ کر بار بار پڑھتے اور خاص خاص دوستوں کو بھی دکھاتے پھر اخبار کا تراشہ ایک فائل میں لگا لیتے۔ یہ 64-1963 کا زمانہ تھا۔ میٹرک کا امتحان دیا تو لاہور بورڈ کے آرٹس گروپ میں ان کی دوسری پوزیشن تھی۔ بہاولپور کے اخبارات نے اپنے اس سپوت کی تصویریں چھاپیں، ان کے انٹرویو لئے یہ سب ان کے پاس اب بھی محفوظ ہیں ان کا وعدہ ہے کہ کسی دن لاہور آئے تو یہ تصویریں مجھے بھی دکھائیں گے جن میں وہ شکل وصورت ہی سے کسی پسماندہ دیہات کے نوجوان نظر آتے ہیں سر پر رومال باندھا ہوا ہے، جیسے مجلس ادب میں قرأت کے لئے کھڑے ہوئے ہوں۔ اور اپنی تجوید کی داد سامعین سے حاصل کر رہے ہوں۔

میٹرک کی کامیابی نے ان کے لئے ترقی کی راہیں کھول دیں۔ کالج کی تعلیم دل لگا کر حاصل کی لیکن اس کے ساتھ ادب کی محبت کی پرورش بھی کرتے رہے۔ 67-1966ء میں رسائل کے مقبول مصنف بن گئے تھے۔ ایک مضمون ''فنون'' میں، ایک افسانہ ''اوراق'' میں شائع ہوا۔ ''ادب لطیف'' نے بھی ان کی پذیرائی کی۔ اب غلام نبی اعوان ادب کی صنف میں رواں ہو گئے پنجاب یونیورسٹی کے ابلاغیات کے شعبہ میں انہوں نے عبدالسلام خورشید کو اپنا پیر اور وارث میر کو اپنا مرشد بنا لیا۔ گزر اوقات کے لئے ''نوائے وقت'' میں شام کی شفٹ میں نوکری حاصل کر لی۔ یہاں ان کی تربیت ظہور عالم شہید، وقار انبالوی، عبدالقادر حسن اور قیوم اعتصامی جیسے صحافیوں نے کی۔ لیکن وہ تعریف کرتے تو جناب مجید نظامی کے ذکر پر رطب اللسان ہو جاتے اور کہتے کہ ''نوائے وقت''

میں ان دونوں ادیبوں کی کہکشاں روشن تھی لیکن قطبی ستارہ مجید نظامی تھے جو محنت سے کام کرنے والے صحافی کی قدر کرتے تھے۔ غلام نبی ''نوائے وقت'' سے نکلے تو ''کوہستان'' میں پہنچ گئے جہاں عبدالوحید خان جماعت اسلامی کی پالیسی کے مطابق اخبار چلاتے تھے۔ اس زمانے میں ان کی ڈائری ''نیرنگئ دوراں'' نے بڑی شہرت حاصل کی۔ ایک بہت بڑی عالمی مشروبات کی کمپنی کی اندر کی کہانی چھاپی تو اس کمپنی کے غنڈے غلام نبی پر چڑھ دوڑے ان کی ہڈی پسلی ایک کر دی، کئی دن ہسپتال میں پڑے رہے لیکن اخبار کے مالکان نے ان کی قانونی حمایت بھی نہ کی تو غلام نبی اعوان نے صحافت کو خیر باد کہہ دیا اور 1971ء میں پاکستان آرمی میں ملازمت اختیار کر لی، یہاں بھی انہوں نے اپنی کلاہ کج رکھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے سب ساتھی ترقی کی منزلیں طے کر کے لیفٹیننٹ جنرل قسم کے اعلیٰ عہدوں پر جا پہنچے اور غلام نبی اعوان کو میجر کے عہدے سے ہی ریٹائر کر دیا گیا۔ فوج کی نوکری میں اخبارات میں بغیر اجازت لکھنا منع ہے لیکن غلام نبی اعوان نے مشق ادب جاری رکھی اور چوری چھپے اخبارات میں بھی چھپتے رہے۔ ٹیلی ویژن کے لئے ڈرامے لکھے اور اخبارات میں کالم لکھے ان دنوں انشائیہ کی صنف پر پرزے نکال رہی تھی غلام نبی اعوان نے اس صنف میں بھی خامہ فرسائی کی۔ پوسٹنگ ملتان میں ہوئی تو ادبی حلقوں کی روح رواں بن گئے اردو اکادمی ملتان میں مضمون پڑھا جاتا تو غلام نبی اعوان بحث میں ضرور حصہ لیتے اور لگی لپٹی رکھے بغیر اپنی بات کہہ دیتے۔ جسے سامعین پسند کرتے لیکن سب مضمون نگار انہیں کڑوی نظروں سے دیکھتے کہ یہ نقاد فوجی بیرکوں سے نکل کر کہاں آ گیا ہے۔ ان دنوں ادب میں صرف تعریف سنی جاتی تھی۔ تنقید پر بھنوئیں تن جاتی تھیں، تیور بدل جاتے تھے۔ غلام نبی اعوان نے یہ سب کچھ برداشت کیا لیکن اپنی عادت میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی آخر فوج سے ریٹائر کر دیئے گئے اور انہوں نے رزق حلال کمانے کے لئے محکمہ تعلیم کا انتخاب کر لیا۔ چند اداروں میں پرنسپل کی خدمات دینے کے بعد نمل یونیورسٹی میں آ گئے۔ چار سال کے بعد یہ نوکری بھی چھوڑ دی۔ اسلام آباد کی ایک این جی او نے ان کی خدمات حاصل کر لیں۔ لیکن 2008ء میں اس ادارے کو بھی خیر باد کہہ دیا۔

اس وقت ان کی عمر 60 سال ہو چکی تھی۔ لہٰذا انہوں نے کسی ادارے کی ملازمت کرنے کا خیال ترک کر دیا اور قلم و قرطاس کی خدمت کرنے لگے۔ ان کی کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

1) ''آشوبِ شعر'' (شاعری) 2) ''اڑان لفظوں کی'' (انشائیے)

3) ''دریچہ'' (کالموں کا مجموعہ) 4) ''تنقیدی اشکال'' (مضامین)

5) ''بلوچستان رومانیت کے آئینے میں'' (رپورتاژ) 6) ''معافی چاہتا ہوں'' (خاکے)

غلام نبی اعوان ٹیلی فون پر بات کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ادب کا ایک دبستان کھل گیا ہے۔ انہیں ادبی معاشرے کی سیاست کا پورا علم ہے۔ ہر ادیب کے بارے میں ان کی رائے ہے۔ جسے کوئی ادیب بھی خوشی سے قبول نہیں کرتا، وجہ ظاہر ہے کہ غلام نبی اعوان سچ بولتے ہیں اور سننے والوں کو سچ کڑوا لگتا ہے بالخصوص اس وقت جب اعوان صاحب اپنا کڑوا مشاہدہ سامنے بیٹھے ہوئے ادیب کے سامنے تند و تیز لفظوں میں پیش کر دیتے ہیں کسی ادبی محفل میں شامل ہوں تو سب ''باادب'' ہو جاتے ہیں۔ غلام نبی اعوان میرے اعوان بھائی ہیں میں ان کا قدر دان ہوں کہ وہ پاکستان میں سچ بولنے اور سچ لکھنے والے معدودے چند ادیبوں میں شامل ہیں۔ شہرت سے بے نیاز ہیں اور جعلی ادیبوں کو خوب پہچانتے ہیں۔ حق تعالےٰ ان کے قلم کو زندہ رکھے۔ (آمین)

''جھومتے لفظ'' غلام نبی اعوان کی نئی کتاب ہے جسے چھاپنے کا شرف مقبول اکیڈمی کو حاصل ہوا ہے۔

⋯⋯⋯ ☆☆ ⋯⋯⋯
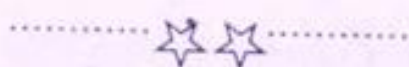
قائم نقوی

قائم نقوی کو میں اپنے دوستوں میں شمار نہیں کرتا۔ کیوں کہ وہ میرے دل کے اتنے قریب ہیں کہ میں انہیں اپنے عزیزوں میں شامل سمجھتا ہوں اور مقبول اکادمی کی طرف آئیں تو ان کی چاپ دفتر ماہ نو سے نکلتے ہی سن لیتا ہوں۔ یعنی مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ قائم نقوی ملاقات کے لئے آ رہے ہیں۔ ان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ خوبصورت با معنی اور مشاعرے میں مقبول ہونے والی غزل کہنے کے باوجود کبھی دوستوں کی محفل میں اپنی غزل سنانے پر زور نہیں دیتے۔ اور ان کی غزل رسالے میں چھپی ہو تو منگنی کی انگوٹھی کی طرح کسی کو نہیں دیتے۔ اس بات پر فخر کا اظہار کرتے ہیں کہ علی پور جیسے دور افتادہ مقام سے نکل کر لاہور آئے تو انہوں نے اپنا ادبی مقام اپنی محنت سے بنایا اور ایم اے تک تعلیم حاصل کی تو اردو اور پنجابی کے ذوق کی پرورش اپنی وہبی قوت سے کی۔ احمد ندیم قاسمی صاحب کے حلقے میں داخل ہوئے تو اپنی عقیدت کو روز افزوں کیا اور ان کے اس احسان کو کبھی نہیں بھلایا کہ وہ جب کہیں لاہور سے باہر مشاعروں میں جاتے تو قائم نقوی ساتھ لے جاتے اور غزل پر داد ابھرنے لگتی تو خوش ہوتے کہ ان کا ایک نیاز مند مشاعرے میں کامیابی حاصل کر رہا تھا۔ اور اس بات کا بھی خیال رکھتے کہ اسے مشاعرے کے اختتام پر اعزازیے کا لفافہ ملا ہے یا نہیں اور پھر اس کو حکومت پاکستان میں ایک ایسے محکمے میں ملازمت اختیار کرنے کا موقع بھی حاصل ہو گیا جو اس کے

ذوق وشوق کے مطابق تھا میری مراد حکومت پنجاب کا وہ اشاعتی محکمہ ہے جس کے تحت ''ماہِ نو'' اور ''پاک جمہوریت'' چھپتا ہے اور دستاویزی فلمیں بنائی جاتی ہیں۔

اس کی پیدائش 6 جون 1949ء کو علی پور میں ہوئی تو اس کا نام سید قائم حسین نقوی رکھا گیا۔ ابتدائی تعلیم ٹاٹ سکولوں میں حاصل کی لیکن وہ سکول کے اچھے طالب علموں میں شمار ہوتے تھے۔ دینی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ سکول میں جب کوئی دینی تقریب ہوتی تو قائم نقوی اس میں ضرور شامل ہوتے۔ سکول کے زمانے میں ہی شعر کہنے لگے تھے۔ کہتے تھے کہ صبح کی اسمبلی میں جب اقبال کی نظم

''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری''

پڑھی جاتی تو میں اس کی موسیقی میں ڈوب جاتا اور خود بھی شعر بنانے لگتا۔ اس ''تک بندی'' کو پہلے اس کے دوستوں نے اور پھر استادوں نے سراہا۔ اس کے حقیقی جوہر لاہور آکر کھلے اور مشاعروں کی داد نے اسے مکمل شاعر بنا دیا۔ اور اب اردو کی نئی غزل اس کے فن پر فخر کر سکتی ہے۔

قائم نقوی نے بڑی ہموار زندگی گزاری ہے۔ یعنی اس نے دفتر ''فنون'' میں مستقل حاضری دینے اور قاسمی صاحب کی عقیدت کو دل و جان سے پالنے کے باوجود ڈاکٹر وزیر آغا اور انور سدید کو ہمیشہ عزت کی نظر سے دیکھا اور ملاقات ہوتی تو ان کو آگے بڑھ کر ملتے۔ ایک دن میں نے یونہی پوچھا'' قائم نقوی صاحب آپ قاسمی صاحب کے مخالفین سے ملتے ہیں تو وہ ناراض نہیں ہوتے''۔ اس نے سادگی سے کہا'' اہل علم وادب کا احترام لازم ہے۔ خواہ وہ کسی فرقے مذہب یا گروپ سے ہوں۔'' میں نے دیکھا کہ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوگئی۔ مجھے اس کی کشادہ نظری پر رشک آیا۔ اور وزیر آغا کی دل سے عزت کرنے کا ثبوت مجھے اس وقت ہوا جب ان کی وفات پر ایک شاندار سیمینار حلقہ ارباب ذوق میں منعقد کیا۔ اس کی صدارت ڈاکٹر انور سدید سے

کرائی اور اس میں مشکور حسین یاد کو بھی مدعو کیا۔ قائم نقوی کے اس اقدام پر اس کی عزت میرے دل میں ہزار گنا بڑھ گئی۔ ایسا حسن عمل خاندانی لوگوں کی گھر کی تربیت کا ہوتا ہے اور وہ زمانے کے منفی اثرات کو قبول نہیں کرتے۔

قائم نقوی نے اپنی زندگی خود بنائی ہے۔ ''ماہ نو'' کا آغاز سید وقار عظیم نے کیا تھا۔ حسن عسکری، رفیق خاور، فضل قدیر، ظفر قریشی نے اسے پروان چڑھایا۔ لیکن کشور ناہید نے اسے مثالی عروج دیا۔ قائم نقوی 1978 میں مدیر مقرر ہوئے تو ان کے لئے بڑا چیلنج تھا لیکن انہوں نے اپنی ادارت میں ''ماہِ نو'' کو مثالی رسالہ بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور 2006ء میں اس کے چیف ایڈیٹر بنا دیئے گئے۔ ان کے دور میں ''ماہِ نو'' پورے پاکستان کے ادیبوں کا رسالہ شمار ہوتا تھا اور اس میں احمد ندیم قاسمی صاحب کے ساتھ ڈاکٹر وزیر آغا بھی شامل ہوتے تھے۔ اور انہوں نے انور سدید سے بھی کئی مضامین ''ماہِ نو'' کے لئے لکھوائے۔ وہ ادب میں اختلاف کو ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن اظہار کی شائستگی کو فوقیت دیتے تھے۔

قائم نقوی کو اردو اور پنجابی غزل میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس کی شاعری کا مجموعہ ''زادِ ہجر'' اور پنجابی شعری مجموعہ ''میلے رمزاں دے'' چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ان کا ایک اور کارنامہ اردو غزل کا انتخاب ہے۔ جو 1987ء سے لے کر 1996ء تک دس مجموعوں کی شکل میں چھپ چکا ہے۔ پنجابی شاعری پر مسعود کھدر پوش ایوارڈ 1988ء مل چکا ہے۔ بہترین شاعر کا ایوارڈ حلقہ اہل قلم نے پیش کیا۔ استاد عشق لہر اکیڈمی ایوارڈ 1981ء میں ملا...... قائم نقوی واحد ادیب ہیں جو حلقہ اربابِ ذوق کے چار مرتبہ سیکرٹری منتخب ہوئے ہیں۔

..........☆☆..........
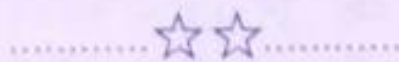
ڈاکٹر کیول دھیر

ڈاکٹر کیول دھیر سے میرا پہلا تعارف اظہر جاوید نے کرایا تھا۔ لیکن یہ غائبانہ تعارف تھا۔ وجہ یہ کہ کیول دھیر آزادی کے بعد مشرقی پنجاب میں چلے گئے تھے لیکن جاتے جاتے اپنی روح پاکستان میں ہی چھوڑ گئے۔ جب ان کی روح انہیں اکساتی تو وہ بے کل ہو جاتے اور دل کی بے قراری کو قرار دینے کے لئے افسانہ لکھنے لگتے۔ ان کے افسانے اظہر جاوید صاحب ''تخلیق'' میں چھاپتے تھے۔ پرچہ لے کر مقبول اکیڈمی کے صدر دفتر میں آتے تو کہتے ''سب سے پہلے کیول دھیر کا افسانہ پڑھو۔ یہ شخص پاکستانی ہے لیکن سیاست کے آزار نے اسے ہندوستانی بنا دیا ہے؟ میں ان کا افسانہ پڑھتا تو واقعی محسوس ہوتا کہ یہ کسی پاکستانی نے لکھا ہے۔ آہستہ آہستہ کیول دھیر میرے دل میں آباد ہو گیا اور میرا یہ احساس بھی پختہ ہو گیا کہ ڈاکٹر کیول دھیر اردو افسانے کا بڑا نام ہے۔ ترقی پسند نقادوں نے ایک خاص قسم کے پھٹے کے افسانوں کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کیا تو کرشن چندر، عصمت چغتائی، مہندر ناتھ، راجندر سنگھ بیدی اور حیات اللہ انصاری کو بہت اچھالا لیکن کیول دھیر کو نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ ایک پبلشر کی حیثیت میں یہ گواہی دے سکتا ہوں کہ کیول دھیر کرشن چندر کے بعد سب سے زیادہ پڑھا جانے والا افسانہ نگار ہے اور سچ پوچھیں تو اسے پسند کرنے والے کرشن چندر سے بھی زیادہ ہیں۔

یہ حقیقت میں نے اس وقت بھی دیکھی جب کیول دھیر لاہور آئے اور ان کے اعزاز میں اظہر جاوید نے ایک محفل ایمبسڈر ہوٹل میں سجائی۔ ان کی آمد اور اس تقریب کی خبر اخبارات میں چھپ چکی تھی تقریب کے دعوت نامے مخصوص لوگوں کو بھیجے گئے تھے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ کیول دھیر کو دیکھنے، اور ملنے پورا لاہور امنڈ آیا اور مردوں سے زیادہ عورتوں کی تعداد تھی۔ بس یوں سمجھئے کہ مینا بازار سجا دیا تھا اظہر جاوید نے، کیول دھیر کا پاکستان کا یہ دورہ صرف اس لئے نہیں تھا کہ وہ اپنی دھرتی کو سلام کرنے آئے تھے بلکہ وہ پاکستان کے ادیبوں کو ساحر اکیڈمی لدھیانہ کی طرف سے دینے کے لئے ''طلائی تمغے'' بھی ساتھ لائے تھے۔ اظہر جاوید صاحب کے گلے میں تمغہ پہنانے لگے تو انہوں نے خاص طور پر یہ جملہ کہا کہ اظہر جاوید پاکستان کے مقبول ترین ادیب ہیں اور ان کا رسالہ ''تخلیق'' سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ مجھے واقعی خوشی ہوئی کہ اب اظہر جاوید بھی ''طلائی تغمہ یافتہ'' ہو گئے ہیں۔ صدر پاکستان نے انہیں پرائڈ آف پرفارمنس' بعد میں دیا۔ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف ہندوستان نے پہلے کیا۔

اب آپ کو یہ بتانا ضروری ہے کہ ڈاکٹر کیول دھیر 5 اکتوبر 1938ء کو ضلع منٹگمری اور حال ضلع وہاڑی کے قصبہ گگو میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد جناب ہنس راج بھی ڈاکٹر تھے۔ اور یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ڈاکٹری ان کو وراثت میں ملی ہے اور جسموں کا علاج کرنا ان کا خاندانی پیشہ ہے۔ کالج کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد عملی زندگی میں داخل ہوئے تو کیول دھیر نے بھی میڈیکل کا شعبہ ہی پسند کیا۔ مریضوں کے حالات سنتے تو وہ ان پر کہانی لکھ ڈالتے جو بڑی پُر اثر ہوتی۔ اپنی یادوں کو لے کر لدھیانہ گئے تو اپنے پرانے وطن کو ہمیشہ یاد رکھا اس کی مثال ان کا سفر نامہ ''خوشبو کا سفر'' ہے۔ یہ خوشبو ان کے جسم سے نکل کر کاغذوں میں سما گئی اور وہ یہ بھی کہنے لگے کہ میرے پڑھنے والے تو پاکستان میں آباد ہیں اور ان سے مل کر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے بھائیوں سے ملا ہوں۔

ڈاکٹر کیول دھیر بے شک بنیادی طور پر ڈاکٹر ہیں لیکن انہوں نے اپنی زندگی میں

ادب کو زیادہ اہمیت دی۔ ساحر لدھیانوی کے فدائی ہیں اور ان کے نام کو روشن کرنے کے لئے انہوں نے ساحر اکیڈمی بنا رکھی ہے۔ جس کا جشن ساحر ہر سال منعقد کرتے ہیں اب حال ہی میں انہوں نے ''ادیب انٹرنیشنل'' کے نام سے ایک ادبی رسالہ جاری کیا ہے جس کی رونمائی کے لئے وہ پاکستان آئے تو اظہر جاوید نے ایک شاندار تقریب پنجابی کمپلیکس میں منعقد کرائی۔ تصویروں کا سیشن شروع ہوا تو وہ میرے ساتھ کھڑے ہوگئے اور کیمرہ مین کو کہا اب جلدی جلدی کلک (Click) کرو۔ یہ تصویر میری کتاب ''شناسائی'' میں بھی شامل ہے اور ہمیشہ یادگار رہے گی۔

کیول دھیر نے ابتدا میں محکمہ صحت پنجاب میں ملازمت اختیار کی تھی۔ 1996 میں ریٹائرمنٹ کے بعد پورا وقت ادب کو دینے لگے۔ پہلے بھی ڈاکٹری کم کرتے تھے۔ مریضوں کی کہانیاں زیادہ لکھتے تھے۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر انہیں اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ کینیڈا، برطانیہ، امریکہ، فرانس اور یورپ کا سفر کر چکے ہیں۔ ان کی کتابوں کی تعداد پانچ درجن سے زیادہ ہو چکی ہے۔ ''اپنا دامن اپنی آگ''، ''شیشے کی دیوار''، ''یادوں کے کھنڈر'' اور ''کہانیاں'' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ''گوری کے دیس میں'' یورپ اور امریکہ کا سفرنامہ ہے۔ ان کے افسانوں کے تراجم دنیا کی چودہ زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ میرا افتخار یہ ہے کہ کیول دھیر مجھے اپنے دوستوں میں شمار کرتے ہیں اور جب کبھی لاہور آئیں تو ملنے کے لئے مقبول اکیڈمی پر تشریف لاتے ہیں۔ جب ملتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے کہ ابھی اگلی شرافت کے کچھ نمونے زندہ ہیں جو نفرتوں کی کوکھ سے بھی محبتوں کے پھول کھلاتے ہیں اور ان پھولوں کی خوشبو ہر طرف پھیلاتے ہیں۔ اظہر جاوید صاحب آپ کا شکریہ کہ آپ نے ڈاکٹر کیول دھیر سے میرا تعارف کرایا اور مجھے ان کا حلقہ بگوش کر دیا۔

''سفر جاری ہے'' پر ان کا خوبصورت تبصرہ میری کتاب ''پذیرائی'' میں شامل ہے۔

............☆☆............
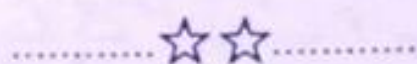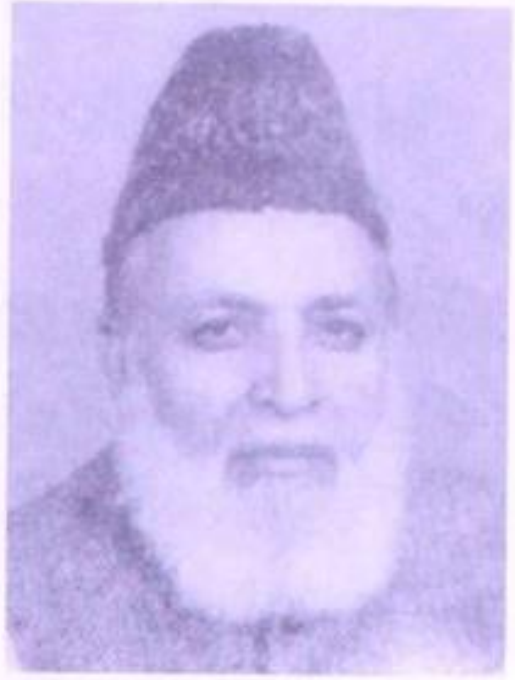
گوہر ملسیانی

برصغیر ہندوستان و پاکستان کے بہت سے شہر اپنی کسی خاص صفت کی وجہ سے شہرت یافتہ ہیں اور ان شہروں کی یہ وجہ شہرت اب انمٹ تاریخی حیثیت بھی حاصل کر چکی ہے۔ میں دہلی، لکھنو، کلکتہ اور لاہور کا ذکر نہیں کر رہا جو ملک کے سیاسی عمل کے بڑے مراکز رہے ہیں۔ میں تو ہاپوڑ کا ذکر کر رہا ہوں جس کے ''پاپڑ'' بہت مشہور تھے۔ ناگ پور کو سنگتروں نے اور الہ آباد کو ''پیٹروں'' نے شہرت دی۔ کئی قصبوں کو شاعروں نے اپنے نام کا حصہ بنا کر زندہ جاوید کر دیا۔ اس ضمن میں ملیح آباد کو جوش صاحب نے اور سیالکوٹ کو علامہ اقبال نے دائمی شہرت سے سرفراز کر دیا۔ مشرقی پنجاب میں تحصیل نکودر ضلع جالندھر میں ''ملسیان'' ایک غیر معروف گم نام سا دیہات ہے۔ لیکن اردو ادب میں اسے شہرت دوام جناب بعورام جوش ملسیان اور ان کے فرزند دلبند عرش ملسیانی نے عطا کر دی۔ ادب کے اس شہرت یافتہ دیہات میں ایک فطری ادیب اور شاعر 15 جولائی 1934ء کو چودھری صدرالدین کے گھر میں پیدا ہوا جو اس علاقے کے نامور زمیندار تھے۔ 1947ء میں جب ملسیان خط تقسیم کی دوسری طرف ہندوستان میں چلا گیا تو چودھری صدرالدین اپنے خاندان کو لے کر گھر سے نکلے اور خون اور آگ کا دریا عبور کر کے پہلے منٹگمری آئے جو اب ''ساہی وال'' کے نام سے موسوم ہوتا ہے لیکن پھر رحیم یار خان منتقل ہو گئے اور یہیں مستقل قیام کیا۔ تشکیل پاکستان کے

وقت ان کے صاحبزادے جو بعد میں شاعر بن گئے اور گوہر تخلص سے معروف ہوئے۔ کی عمر 13 سال تھی اور ان کا شعور بیدار ہو چکا تھا۔ انہوں نے ملسیان سے منٹگمری تک کا سفر کھلی آنکھوں سے کیا اور دیکھا کہ اس علاقے کے دو سکھ جو پہلے مسلمانوں کے ساتھ شیر و شکر تھے۔ اب ان کے کتنے دشمن ہو گئے تھے اور وہ نہ صرف مسلمانوں کی مال و املاک کو لوٹ رہے تھے بلکہ مردوں کو شہید کر رہے تھے عورتوں کی بے حرمتی کر رہے تھے۔

پاکستان پہنچ کر اس کنبے نے خدا کا شکر ادا کیا کہ امن کی سرزمین پر پہنچ گئے تھے اور اب اپنے خوابوں کے اس وطن میں چودھری صدرالدین نے نئی زندگی شروع کی۔ اپنے بیٹے کو رحیم یار خان کے سکول میں داخل کرا دیا جہاں ان کو علمی اور ادبی تربیت کے علاوہ شخصیت سازی کا فریضہ نقوی احمد پوری نے ادا کیا۔ انہوں نے ہی اس نوجوان کے باطن سے ایک شاعر کو بیدار کیا۔ اب وہ پاکستان کی پہچان ہیں۔ لیکن اپنے پرانے قصبے کو کبھی نہیں بھلایا اور اسے اپنے نام کا حصہ بنا لیا۔ چنانچہ اب یہ کہنا درست ہے کہ اب گوہر ملسیانی نے پاکستان میں ملسیان کی پہچان میں جوش اور عرش صاحب کے ساتھ شرکت کر لی ہے۔

جناب گوہر ملسیانی تقسیم کے وقت آگ اور خون کے دریا سے گزرے تو اولاً ان کے دل میں اسلام کی سچی محبت جاگی جس نے کفرستانِ ہند میں دو قومی نظریے کی بنیاد فراہم کی تھی۔ دوم انہیں پاکستان کی اہمیت کا احساس دلایا جو قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اسلام کی تجربہ گاہ اور مسلمانوں کے تہذیبی فروغ کے لئے حاصل کیا تھا۔ ان کو ابتدا میں ہی یہ احساس ہو گیا کہ اب اسلام ان کا ملجا اور پاکستان ان کا ماوا ہے۔ انہوں نے رزق حاصل کرنے کے لئے درس و تدریس کا شعبہ اختیار کیا اور اپنے طالب علموں کو بھی اسلام اور پاکستان کی سچی خدمت کا درس دیا۔ اسی دوران انہیں احساس ہوا کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکے اور اب کالج اور یونیورسٹی میں داخلہ بھی نہیں لے سکتے۔ چنانچہ انہوں نے از خود امتحانات پاس کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا اور ایم اے، ایم فل تک کئی ڈگریاں حاصل کر لیں۔

جناب گوہر ملسیانی کی بنیادی پہچان ایک خوش فکر شاعر کی ہے۔ ان کے شعری مزاج کو جناب نقوی احمد پوری نے طالب علمی کے زمانے میں ہی سنوارا تھا اور اس زمانے

میں ہی شعر کہتے تو نقوی احمد پوری سے داد حاصل کرتے کہ ان کے اشعار میں ندرت تھی، جدت تھی، تازہ کاری تھی۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ ''جلتی رتوں کی یاد'' میں شائع ہوا تو اسے اہل ادب نے بہت پسند کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ''غزل نگاری'' گوہر ملسیانی کی منزل نہیں تھی ان کے اندر تو ایک سچا اسلام پسند شاعر موجود تھا۔ قرآن کریم کی باترجمہ تلاوت اور قرآنی کتب کے مطالعے نے ان کو تاریخ اسلام کی طرف راغب کیا۔ اس دور میں شبلی نعمانی کی ''سیرۃ النبیؐ'' ان کی محبوب ترین کتاب تھی۔ میرا خیال ہے کہ سیرت نبوی کے مطالعے نے انہیں نعت گوئی کی طرف مائل کیا۔ چنانچہ انہوں نے اس مقدس صنف میں ''مظہر نور''، ''متاع شوق''۔ اور جذبات شوق کے نام سے نعت کے تین مجموعے شائع کئے۔ ان کی دیگر ادبی کتابوں میں ''تنقید و تحقیق''...... ''اقبال...... علامہ اقبال کیسے بنے''...... ''کاروان جہان'' ...... ''انتخاب کلام شکیل بدایون''...... ''عصر حاضر کے نعت گو''...... ''انتخاب نظم و غزل''، ''بچوں کی نظمیں'' بہت مشہور ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو فریضہ حج کی سعادت عطا کی تو واپسی پر سفر نامہ ''حرمین شریفین کی فضاؤں میں'' لکھا یہ سفر نامہ ان کیفیات کا آئینہ ہے جو گوہر ملسیانی پر ارض مکہ و مدینہ کے دوران ان کے دل پر شبنم کی طرح اترتی رہی تھیں۔ بلاشبہ گوہر ملسیانی کا خاص میدان نعت ہی ہے لیکن وہ مسائل جہاں سے غافل نہیں اور ''نوائے وقت'' ملتان میں کالم بھی لکھتے رہے ہیں۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ گوہر ملسیانی مقبول اکیڈمی کے نامور قلمی معاون ہیں۔ جب کبھی لاہور آئیں تو مقبول اکیڈمی پر تشریف لاتے ہیں۔ ان کی آمد پر میرا دفتر معطر ہو جاتا ہے۔ یہ خوشبو ان کی شخصیت سے اٹھ رہی اور پھیل رہی ہوتی ہے۔

گوہر ملسیانی نے میری کتاب ''سفر جاری ہے'' پر ''محبت و محنت کی زنبیل'' کے عنوان سے خوبصورت علمی ادبی تبصرہ کیا ہے۔

☆☆

پروفیسر محمد مظفر مرزا

بہت لمبے عرصے تک پروفیسر محمد مظفر مرزا نے اپنی زندگی ماہر اقبالیات مرزا محمد منور کے سائے میں بسر کی جوان کے بڑے بھائی تھے اور علمی، ادبی، تہذیبی، اور دینی حلقوں میں اپنی وطن دوستی اور اقبال شناسی کے لئے بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ہندو قوم پرستوں ہندوؤں سے خاص طور پر مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کے بارے میں بھی ان کی رائے عام لوگوں سے مختلف تھی۔ اور سردار پٹیل کو تو وہ پاکستان دشمن قرار دیتے تھے۔ یہ تمام اوصاف مظفر مرزا کو اپنے بڑے بھائی سے ملے۔ میں نے ان کی ایک کتاب چھاپی تو ڈاکٹر انور سدید نے ان کے چار اوصاف گنوائے۔

اوّل: اسلام دوستی　　دوم: پاکستان سے محبت

سوم: اقبال سے عقیدت　　چہارم: قائداعظم کی سیاسی بصیرت پر یقین

اس کے ساتھ ہی انور سدید کہتے ہیں کہ ان کا سب سے بڑا کریڈٹ یہ ہے کہ وہ مرزا ہاشم الدین کے فرزند ہیں جو ان کے چوتھی جماعت میں استاد تھے۔ اور ان کے دل میں ادب کا ذوق پیدا کیا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مرزا مظفر کو ادب کا ذوق ورثے میں ملا ہے۔ انہوں نے بھی اپنے والد محترم مرزا ہاشم الدین اور برادرِ بزرگ مرزا محمد منور کی طرح دنیا کے تمام دوسرے محکموں پر لات ماری اور نئی نسل کے بچوں کی تعلیمی تربیت اور شخصیت

سازی کے لئے تعلیم کا محکمہ انتخاب کیا اور اپنی زندگی میں درس وتدریس کو اہمیت دی۔ ایک دن بتانے لگے کہ ہماری اگلی نسل بھی تعلیم وتدریس کے سلسلے کو ہی آگے بڑھا رہی ہے۔ ان کی صاحبزادی صبا مرزا ایم اے کرنے کے بعد ایجوکیشن یونیورسٹی کے ایک کالج سے وابستہ ہیں۔

پروفیسر محمد مظفر مرزا 8 اپریل 1943ء کو سرگودہا میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سرگودھا سے حاصل کی لیکن ایم اے پنجاب یونیورسٹی سے کیا اور پھر محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لی۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج جھنگ اور گورنمنٹ کالج سرگودھا میں 1965ء سے لے کر 1980ء تک بی اے تک کے طلباء کو تعلیم دی۔ ان کا شعبہ پولیٹیکل سائنس تھا لیکن وہ اپنے طلباء کے دل میں ادب کی شمع بھی روشن کر دیتے تھے۔ 1981ء میں انہیں گورنمنٹ کالج ماڈل ٹاؤن لاہور میں تبدیل کر دیا گیا تو انہوں نے باور کر لیا کہ اب وہ بڑے سمندر میں آگئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی سرکاری ڈیوٹی کے ساتھ کئی غیر نصابی کام بھی شروع کر دیئے مثلاً وہ حکومت پنجاب ''تحریک پاکستان سیل'' میں انڈر سیکرٹری کی خدمات دیتے رہے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب کی ہدایت پر انہوں نے ''نفاذ اردو'' کے لئے کئی لیکچر دیئے۔ لاہور اب ان کا مستقل مسکن بن گیا تھا مختلف کالجوں میں خدمات انجام دینے کے بعد انہیں گورنمنٹ زمیندارہ کالج گجرات کا پرنسپل مقرر کیا گیا اور وہیں سے 18 اپریل 2003ء کو ریٹائر ہوگئے۔ لیکن ان کے جنون نے ان کو فارغ نہ بیٹھنے دیا اور وہ ''بزم اقبال'' سے وابستہ ہوگئے جہاں وہ خود بھی ''اقبالیات'' پر تحقیقی کام کر رہے ہیں اور دوسروں سے بھی کروا رہے ہیں۔

پروفیسر محمد مظفر مرزا بہت سی کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔ ان کی کتابوں کی تعداد دو ہاتھوں کی انگلیوں پر گنی نہیں جاسکتی صرف مقبول اکیڈمی سے ان کی کتابیں ''مطالعہ پاکستان''، ''عرشِ آزادی''، ''مسلم لیگ ایک قومی تحریک''، ''ملت کا پاسبان'' اور ''قائداعظم کے سیاسی پیروکار'' شائع ہو چکی ہیں۔ ایک دن میں نے ان کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست بنائی تو یہ تعداد 34 بنی۔ سات کتابیں مکمل ہو چکی ہیں اور زیر طبع ہیں۔ کہنے لگے کہ وہ

اب بھی بیک وقت سات کتابوں پر کام کر رہے ہیں اور کتابوں کی نصف سنچری مکمل کرنے والے ہیں۔ ان کی کئی کتابیں سکولوں میں غیر نصابی کورس کے طور پر شامل ہیں لیکن نصاب کی طرح پڑھائی جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تاریخی واقعات کی صداقت پر زور دیتے اور لکھتے وقت گہری تحقیق سے کام لیتے ہیں۔ دوسرے وہ آسان زبان استعمال کرتے ہیں اور مشکل موضوع پر بھی قلم آزمائی اس طرح کرتے ہیں کہ بچے بھی آسانی سے سمجھ جائیں۔ ان کی کتابیں پڑھ کر سی ایس ایس کے امتحان میں کئی لوگوں نے ''مطالعہ پاکستان'' میں سب سے زیادہ نمبر لئے جوان کے کامیابی کے تناسب میں اہم کردار ادا کر گئے۔

مرزا مظفر صاحب ایوارڈ یافتہ مصنف ہیں۔ انہیں یہ ایوارڈ مطبوعہ کتابوں پر دیئے گئے۔ مثلاً ان کی کتاب ''عظیم قائد'' پر نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد نے ایوارڈ پیش کیا۔ دوسرا بڑا ایوارڈ ''ملت کا پاسبان'' پر دیا گیا۔

اب یہ بتانا بھی مناسب ہے کہ محمد مظفر مرزا اپنے بڑے بھائی مرزا محمد منور جو اپنے زمانے میں مشہور ماہر اقبالیات تھے کے سائے سے نکل آئے ہیں۔ اب ان کا ذکر ان کے اپنے میرٹ پر ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کی اعلیٰ علمی خدمات پر سب لوگ انہیں ''علامہ'' تسلیم کرتے ہیں۔

علامہ محمد مظفر مرزا ایرانی قدروں کے نگہبان ہیں۔ وہ ہر وقت پاکستان کی محبت میں شمار رہتے ہیں۔ نوائے وقت کے چیف ایڈیٹر جناب مجید نظامی ان کے قدردان ہیں اور ان کی قومی خدمات کو سراہتے ہیں۔ ''بزمِ اقبال'' کی خدمات کے علاوہ وہ ''نوائے وقت'' میں نظریاتی اور ثقافتی کالم بھی لکھتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک اخبار نے ''امن کی آشا کے نام پر ہندوستان کی تعریفیں شروع کیں تو علامہ مظفر مرزا نے اس کا منہ توڑ جواب دیا اور ہندوانہ ذہنیت کو بے نقاب کر دیا۔ میں ان کی عزت دل و جان سے کرتا ہوں کیوں کہ وہ ایک علمی گھرانے کے فردِ عظیم ہیں اور دیانت و امانت کے پاسدار ہیں۔

☆☆

محیط اسمٰعیل

محیط اسمٰعیل عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں، لیکن ان کی دانش اکیسویں صدی کی ہے اور اس لئے میں انہیں اپنا بزرگ سمجھتا ہوں۔ مقبول اکیڈمی پر تشریف لائیں تو کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اور جب تک وہ کرسی نشین نہ ہوں میں کھڑا رہنا ضروری سمجھتا ہوں اُردو اس روانی سے بولتے ہیں کہ اہل زبان بھی ان کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔ ایک دن انہوں نے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ ان کی پیدائش جنوبی ہند کے شہر بنگلور میں ہوئی تھی۔ ان کی ولادت کی تاریخ 22 اکتوبر 1959ء ہے۔ اور دن جمعرات کا تھا۔ تعلیم کے معاملے میں انہوں نے کسی رسمی یا روایتی درس گاہ کو اہمیت نہیں دی اور اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ وہ تلمیذ الرحمان ہیں اور انہوں نے الفاظ کی تمیز اپنی والدہ محترمہ سے حاصل کی جو پنگھوڑے سے لے کر شعور کی پختگی تک ان کی اُستاد ہیں۔ انہوں نے ہی محیط اسمٰعیل کو بولنا، پڑھنا اور لکھنا سکھایا۔ ڈاکٹر صاحب حکیم محمد اسمٰعیل خان کا ذوق ادب پاکیزہ اور پختہ تھا۔ انہوں نے ادب کی پرداخت اور ذوق کی پرورش کی۔ نثر لکھنے کی ترتیب دی۔ غلط جملے پر ٹوکتے اور صحیح جملے پر شاباش دیتے۔ کتاب کے ساتھ محبت کرنے کا سلیقہ دیا۔ کہنے لگے کہ میرا خاندانی نام محبوب خان رکھا گیا۔ لیکن میں نے ادب میں قدم رکھا تو آپ نے محیط اسمٰعیل نام اختیار کیا لاحقہ کی نسبت ان کے والدِ محترم کے ساتھ ہے۔

محیط اسمٰعیل پاکستان آئے تو سب سے پہلے لاہور میں قدم رنجہ فرمایا۔ یہ شہر انہیں اتنا پسند آیا کہ پھر اسی کو اپنا وطن بنالیا۔ ایسے ان کے پاؤں میں چکر تھا۔ ہر وقت گردش میں رہتے۔ جس شہر سے کتابوں کی خوشبو آتی وہاں پہنچ جاتے۔ تھوڑی دیر قیام کرتے، کتابوں کی خوشبو دل میں بساتے اور واپس لاہور آجاتے۔ لاہور کے ادبی حلقوں میں فعال ترین نوجوان تسلیم کئے جاتے ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے پورے لاہور کو اپنے محیط میں لے رکھا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ پورا پاکستان ان کے محیط میں ہے۔ انہوں نے ادب کو اپنی ریاضت سے پرکھا ہے۔ ویسے لاہور میں ان کا اٹھنا بیٹھنا ادیبوں کے ساتھ ہی تھا۔ احسان دانش صاحب کو تو اپنا استاد مانتے ہیں اور سراج منیر کو دوست تسلیم کرتے ہیں۔ دونوں کے اثرات اپنی نفاستِ طبع کی انفرادیت کے ساتھ قبول کئے اور ایسے ادیب بن گئے جو اپنی خودی کو پہچانتے تھے اور دوسروں کی غلطیاں پکڑنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اُردو املا کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تو ''خط محیط'' جاری کیا۔ اور اس خط سے سعادت حسن منٹو کے خطوط کی اصلاح کر چکے ہیں۔ اور اپنے خاکوں کی کتاب شائع کر چکے ہیں۔

انکسار محیط اسمٰعیل کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ لفظوں کی مرمت ان کا شوق ہے اور یہ ایسی بلندی ہے جس کی پستی کا تصور بھی وہ نہیں کرتے۔ ان کی شخصیت کا پورا عکس ان کی غزل میں موجود ہے۔ انہوں نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے الفاظ کا خزینہ اس طرح مرتب کیا ہے کہ ان کے سوا کسی دوسرے شاعر کی غزل میں استعمال ہوں تو صاف پتہ چل جاتا ہے کہ اس شاعر نے محیط اسمٰعیل سے استفادہ کیا ہے۔ وہ جس شخص سے محبت کرتے ہیں اس کی عقیدت میں ڈوب جاتے ہیں اور جس کا قارورہ پہچان لیں، اس کا نام اپنے ملاقاتیوں کی فہرست سے کاٹ دیتے ہیں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ محیط اسمٰعیل کی محبت بھی عمیق اور نفرت بھی گہری ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ انسانی قدروں کو ادب کی قدروں پر غالب نہیں آنے دیتے اور غلطی کی نشاندہی ادیبوں کے منہ پر ہی نہیں کرتے رسالے میں بھی چھپوا دیتے ہیں اور پھر تردید پر کبھی آمادہ نہیں ہوتے گویا ان کا فرمایا ہوا ہمیشہ مستند ہوتا ہے۔

ان کے اظہار کی ایک اور صنف خاکہ نگاری ہے۔ اور وہ جس شخص کو جس رنگ میں

دیکھتے ہیں، اسی رنگ میں اس کی تصویر بناتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کی طرح وہ بھی گنج کو کنگھی نہیں دیتے۔ کسی کی آنکھ کی ٹیڑھ کو درست نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ جس ادیب کا خاکہ لکھتے ہیں وہ ان کا دشمن بن جاتا ہے۔ ان کے اس عمل سے صرف مشفق خواجہ بچے ہیں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ محیط اسمٰعیل کو خواجہ صاحب کی شخصیت میں کوئی خامی نظر نہیں آئی۔ اگر نظر آجاتی تو لکھنے سے گریز نہ کرتے۔

فنی لحاظ سے وہ اردو کتابت کی پروف ریڈنگ کے ماہر ہیں۔ مشینی کتابت کے دور میں جس باریک بینی سے پروف محیط اسمٰعیل پڑھتے ہیں اور کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ان کی پروف خوانی کی ہوئی کتاب میں کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ تاحال اس دعویٰ کو کوئی باطل ثابت نہیں کر سکا۔ محیط اسمٰعیل ان دنوں اکیسویں صدی کی جامع لغت تالیف کر رہے ہیں اور میں ان کی کامیابی کے لئے دُعا کر رہا ہوں۔ میری خودنوشت ''سفر جاری ہے'' پر ان کا مضمون حق گوئی کی مثال قرار دیا گیا ہے۔

☆☆
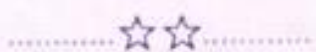
پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ سے مجھے ملاقات کا کبھی شرف حاصل نہیں ہوا لیکن انہوں نے میری کتاب ''سفر جاری ہے'' پر علی گڑھ (بھارت) سے تبصرہ لکھ کر بھیجا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ انہوں نے کتاب میں دلچسپی نہیں لی بلکہ میری دیہاتی زندگی پر ایک غائر نظر ڈالی ہے اور پھر اس کتاب پر اس محبت سے تبصرہ لکھا ہے کہ میں ان کا گرویدہ ہو گیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ تبصرہ ایک نادیدہ اور غیر متعارف شخصیت نے لکھا تھا اور اس میں دوست نوازی کا عنصر شامل تھا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا تو ان سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور انہوں نے مجھے اپنی کتاب ''ایک بھاشا''...... جو مسترد کر دی گئی بھی بھیجی جس میں لگے ہوئے ڈاک ٹکٹ میں نے شمار کئے تو ان کی مالیت ساڑھے تین سو روپے تھی۔ یعنی کتاب کی قیمت سے چار گنا زیادہ۔ تاہم مرزا خلیل احمد بیگ کے اس تحفے نے مجھے مزید متاثر کیا۔

مرزا خلیل احمد بیگ یکم جنوری 1945ء کو گورکھ پور (یوپی) میں ایک معزز زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ گورکھ پور کو ادب میں رگھوپتی سہائے فراق نے شہرت دی ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ مرزا خلیل احمد بیگ نے اپنے نام کے ساتھ کبھی ''گورکھ پوری'' نہیں لکھا۔ میرے خیال میں وہ مقامیت پسند نہیں ہیں اور اپنے نام کو ہی اپنی

پہچان بنانا پسند کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ''گورکھ پوری'' کا لاحقہ فراق صاحب کے حقوق کا تحفظ کرنا چاہتے ہیں۔ بہر حال یہ تو ایک تاریخی حقیقت ہے جو ان کے مقام پیدائش کے بارے میں ہے اور وہ اس کا ذکر نہ بھی کریں تو اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مرزا خلیل احمد بیگ کے والد صاحب نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی تھی لیکن ان کی ابتدائی تعلیم کا انتظام گورکھ پور میں ہی کیا تا کہ ان کے تبادلوں کی وجہ سے تعلیم میں ہرج نہ ہو۔ 1964ء میں علی گڑھ کی سرزمین نے ان کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ ہر چند وہ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم کی تکمیل کے لئے آئے تھے اور انہوں نے اس ممتاز یونیورسٹی سے بی اے اور ایم اے کے امتحانات پاس کئے اور ''شمالی ہند کی اردو کے تاریخی قواعد'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی لیکن بڑی حقیقت یہ ہے کہ تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ گورکھ پور واپس نہیں گئے اور علی گڑھ کو ہی اپنا مستقل مسکن بنالیا۔ علی گڑھ میں انہیں ممتاز ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خان کا قرب نصیب ہوا۔ انہوں نے مرزا خلیل بیگ کا رجحانِ طبع لسانیات کے صبر آزما کام کی طرف پھیر دیا۔ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں استاد مقرر ہوئے تو ان کا انتخاب ''لسانیات'' کی تدریس کے لئے کیا گیا۔ یہ تعلق عمر بھر کا تھا۔ چنانچہ ترقی پا کر پروفیسر کے عہدے پر پہنچے۔ صدر شعبہ کی حیثیت میں ملازمت کے آخری پانچ سالوں (2001ء تا 2006ء) کام کیا اور اسی عہدے سے ریٹائر ہو گئے۔ اس دوران انہیں امریکہ کا علمی سفر کرنے کا موقع ملا اور انہوں نے امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں میں لیکچر بھی دیئے۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ مرزا خلیل احمد بیگ صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا تھا۔ لیکن علی گڑھ نے ان کی نثر کو پروان چڑھایا اور علمی اور ادبی موضوعات پر مضامین لکھنے لگے جو ملک کے اعلیٰ ادبی رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ ان کا بنیادی رجحان تحقیقی تھا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان ان کے پی ایچ ڈی کے نگران مقرر ہوئے تو انہوں نے لسانیات کے موضوع میں ان کی دلچسپی کو مستقل حیثیت دے دی۔ اور مرزا

صاحب نے بھی اس موضوع کو مستقل حیثیت دی۔ اب اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے اور اہم ماہر لسانیات ہیں۔ اور ان کی کتابوں میں پہلی کتاب حلقوں میں بڑی دلچسپی سے پڑھی گئی۔ میں نے ایک دفعہ ڈاکٹر وحید قریشی سے پوچھا کہ اس وقت ہندوستان کا اہم ترین ماہر لسانیات جس کے فیصلوں کو اسناد کا درجہ حاصل ہے......کون ہے؟ تو ڈاکٹر وحید قریشی اس سوال پر ایک لمبی سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے زندہ ماہر لسانیات میں تو ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کا نام ہی لیا جا سکتا ہے ان کی چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

''اردو کی لسانی تشکیل''، ''لسانی تناظر''، ''تنقید اور اسلوبیاتی تنقید''، ''بھارت میں ہندی اور اردو کا سماجی ولسانیاتی تناظر'' (یہ کتاب انگریزی میں ہے)۔ ڈاکٹر گیانی چند کی متنازعہ کتاب ''ایک بھاشا، در لکھاوٹ، در ادب'' کے جواب میں انہوں نے ''ایک بھاشا''......جو مسترد کر دی گئی لکھی۔

بھارت میں انہیں کئی اعزازات سے نوازا گیا۔ پاکستان نے ان کی خدمت میں ''نقوش ایوارڈ'' پیش کیا۔ میں نے انہیں دیکھا نہیں، لیکن دل میں کئی مرتبہ آرزو پیدا ہوئی کہ ویزا نہ بھی ملے تو میں علی گڑھ میں ان سے ملاقات کر آؤں۔ لیکن پھر سوچا کہ ویزے کے بغیر ہندوستان جانا مناسب نہیں۔ اب میں ان کے علمی انہماک کو ان کی تصویر میں دیکھ کر خوش ہو جاتا ہوں۔ آپ مجھے ان کا پاکستانی نیاز مند سمجھئے۔

''سفر جاری ہے'' پر محترم مرزا خلیل احمد بیگ کا تبصرہ دسمبر 2007ء میں ماہنامہ ''اخبار اردو'' اسلام آباد میں شائع ہوا۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ ''سفر جاری ہے'' ملک مقبول احمد کا ایک گراں قدر علمی و ادبی کارنامہ ہے۔ اس نے اُردو میں خودنوشت نگاری کو ایک نیا موڑ دیا ہے اور ایک نئی جہت سے روشناس کرایا ہے۔ یہ کتاب بلاشبہ اُردو کے سوانحی ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے جس سے کوئی بھی ادبی مورخ صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔

............☆☆............

ڈاکٹر معصوم شرقی

ڈاکٹر معصوم شرقی میرے غائبانہ دوست ہیں اور ہمارے درمیان اردو ادب قدرِ مشترک کا درجہ رکھتا ہے۔ بہت عرصہ پہلے ہندوستان سے ادبی رسائل کی آمد کا سلسلہ جاری تھا تو میری ان سے غائبانہ ملاقات ہوتی رہتی تھی اور مجھے خوشی ہوتی کہ وہ غزل میں حالاتِ زمانہ کا حقیقت پسندانہ عکس پیش کرتے تو ہندوستان کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی پر بھی بڑے واضح اشارے کرتے جاتے اور ان کے خیال کی پرواز ملکوں کی حد بندیوں کو عبور کر جاتی تو وہ انسان بیدار ہو جاتا جو دنیا کے کسی بھی حصّے میں انسانوں پر روا رکھنے والے ظلم و جبر کو قبول نہیں کر سکتا اور حرفِ احتجاج اس کی زبان پر آ جاتا ہے۔ میں نے اپنی کتاب ''سفر جاری ہے'' شائع کی تو میری خواہش تھی کہ اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر معصوم شرقی صاحب کو پیش کروں اور اس کتاب پر ان کی بے لاگ اور بے تعصب تنقیدی رائے حاصل کر سکوں۔ ڈاکٹر صاحب نے میری گزارش قبول کی اور نہ صرف اپنی رائے بھیج دی بلکہ مجھے اپنے بارے میں ذاتی معلومات سے بھی سرفراز فرما دیا۔

معصوم شرقی صاحب 4 نومبر 1948ء کو 24 پرگنہ (شمالی کلکتہ) میں پیدا ہوئے اس دور میں بنگال ٹیگور اور قاضی نذر الاسلام کے گیتوں سے معمور تھا لیکن اردو شعرا میں

وحشت کلکتوی کو قبول عام حاصل تھا جو غالبؔ کے رنگ میں شعر کہنے میں شہرتِ عام رکھتے تھے۔ معصوم شرقی نے اس ادب پرور ماحول میں آنکھ کھولی تو ادب کا ذوق روزِ اوّل سے ان کے دل میں پرورش پانے لگا۔ انہوں نے پرائمری سے ایم اے تک کی تعلیم کے دوران نمایاں کامیابیاں حاصل کیں لیکن ادب کی پرورش اور اپنے ذوق کی تسکین سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ انہوں نے ایم اے کے بعد پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ اس وقت تک ملک میں ان کی شہرت کا آفتاب نصف النہار تک پہنچ گیا تھا اور شاعری کے علاوہ وہ نثر میں بھی مضمون نگاری اور مقالہ نویسی کرنے لگے تھے۔

عملی زندگی میں بھی انہوں نے درس و تدریس کا شعبہ پسند کیا اور اپنی تخلیقی اور تنقیدی لگن سے ہزاروں طلبا کو فیض یاب کیا۔ اردو تحقیق، تنقید، کتابوں پر بے لاگ تبصرہ نگاری انہیں پسند ہے اور ان کا زیادہ وقت نئی کتابوں کے مطالعے میں صرف ہوتا ہے لیکن وہ اپنے فن میں سب سے زیادہ اہمیت شاعری کو دیتے ہیں اور شاعری میں یوں تو انہوں نے بہت سی اصناف میں گراں قدر تخلیق کاری کی ہے لیکن ان کی محبوب صنف غزل ہے جس میں عصری صداقت کو وہ جرأت مندی سے پیش کرتے ہیں۔ چند اشعار حسبِ ذیل ہیں:

طوفاں نفس نفس ہے، قیامت قدم قدم
ہے زندگی یہی تو پھر اس کی دعا نہ دے

بے حقیقت ہیں یہ سب دیوار و در کی بندشیں
قید کرسکتا نہیں قدموں کو گھر کا دائرہ

بجھائی دے تو کیسے حق پرتی
ہوس نے سب کو اندھا کر دیا ہے

معصوم شرقی کی شاعری میں آشوبِ آگہی کے ساتھ زمانہ اپنی جھلک دکھاتا ہے لیکن انہوں نے غزل کی داخلیت کو بھی اپنی شاعری میں نمایاں کرنے اور ذات کا آئینہ بنانے کی کوشش کی ہے اور بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں اور نفی میں اثبات کا منظر دکھایا ہے۔

نثار تیری اسی ایک ادائے خاص کے ساتھ
جو دوستی ہی نہ ٹھہرے نہ دشمنی ٹھہرے

یوں تو پہلے بھی تھا میری ذات سے اس کو لگاؤ
مہرباں مجھ پہ آشوبِ جہاں ایسا نہ تھا

مجھ کو آتی ہے تری سادہ مزاجی پہ ہنسی
تو جو اس دور میں جینے کی دعا دیتا ہے

معصوم شرقی صاحب کی کتابوں میں ''لمحوں کے قدم'' اور ''صدائے العطش'' کو قبول عام حاصل ہو چکا ہے۔ ''تراشیدہ'' اور نقد و تجزیہ'' ان کی تنقیدی کتابوں کے نام ہیں جن میں عصری ادب اور ادیبوں پر مضامین شامل ہیں اور ان کی اپنی نظریاتی جہت بھی سامنے آتی۔ انہوں نے تحقیقِ ادب کا جوہر اپنی کتاب ''اشک امرتسری'' میں دکھایا ہے یہ کتاب ایک گم شدہ شاعر کو بازیافت کرتی اور اس کے ادبی اوصاف کا اعتراف کرتی ہے ادبی تاریخ نگاری ان کا نقشِ خاص ''تاریخ ادب اور مغربی بنگال کے پس منظر میں ۱۸۵۷ سے ۱۹۷۴ تک'' ہے مجھے بتایا گیا ہے کہ ان کی دو کتابیں بنگلہ دیش میں اردو ادب

کے سو سال ۱۹۰۱ سے ۲۰۰۰ تک)اور رباعیاتِ سرمد کا تنقیدی جائزہ'' بھی زیرِ اشاعت ہیں۔ معصوم شرقی کو ہندوستان میں ''بالیدگیِ فکر کا شاعر'' تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کی نثر میں جو کشادگی اور گہرائی ہے وہ انہیں ''بلوغت نظر'' ادیب قرار دیتی ہے۔ میں نے ان کا ذکر ڈاکٹر انور سدید سے کیا کہ تو وہ محرومی کے احساس سے دوچار ہو گئے کہ ڈاکٹر معصوم شرقی کی کوئی کتاب انور سدید کی ذاتی لائبریری میں نہیں تھی اور بازار سے بھی دستیاب نہیں تھی۔ معصوم شرقی لاہور سے ہزاروں کوس دور کولکتہ میں اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ میں ان کی کوئی کتاب دیکھتا ہوں تو وہ مجھے میرے دل کے قرب میں آباد نظر آتے ہیں اور میں ان کی صحت مند درازیٔ عمر کے لیے دعا کرنے لگتا ہوں۔

............☆☆............

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

آج کے زمانے میں ڈاکٹر عاشق ہرگانوی ہندوستان میں اُردو کے سب سے زیادہ تیز رفتار اہل قلم ہیں۔ وہ کتابیں اس طرح تصنیف وتالیف کرتے ہیں جیسے مشاعرے کے شاعر طرح مصرع پر غزل کہتے ہیں۔ وہ ادب میں وحدت کی نہیں کثرت کی مثال ہیں وہ اب تک ایک سو سے زیادہ کتابیں چھاپ چکے ہیں لیکن ان کا قلم اعلان کر رہا ہے کہ ''ابھی تو میں جوان ہوں'' ان کی کثرت نویسی کو ہندوستان میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمان فاروقی اور پاکستان میں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، اظہر جاوید، برطانیہ میں محمود ہاشمی (کشمیر اداس ہے والے) اور خلیجی ممالک میں محمد ممتاز راشد وغیرہ سب کرتے ہیں۔ مجھے ان کی بات اچھی لگتی ہے کہ وہ اپنے معاصرین کو متعارف کرانے میں گہری دلچسپی لیتے ہیں اور اپنے کسی ادیب دوست پر مضمون نہیں لکھتے بلکہ پوری کتاب تالیف کر ڈالتے ہیں اور پھر کتاب دہلی سے چھپوا کر اس طرح تقسیم کرتے ہیں کہ ان کے ادیب دوست کے فن اور شخصیت کا ڈنکا پوری ادبی دنیا میں بجنے لگتا ہے۔

مناظر عاشق ہرگانوی یکم جولائی 1948ء کو پیدا ہوئے۔ اب تقویم کے اعتبار سے ان کی عمر 60 سال سے تجاوز کر گئی ہے لیکن ان کے چہرے کی معصومیت ظاہر کرتی ہے کہ ان کے دودھ کے دانت بھی سلامت ہیں۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے بچپن میں ہی

باشعور ہو گئے تھے اور اُردو ادب کے ذوق کے ساتھ پرورش پانے لگے تو ایم اے اُردو کر ڈالا۔ لیکن ایک ایم اے پر طبیعت سیر نہ ہوئی۔ اس لئے فارسی میں بھی ایم اے کی ڈگری حاصل کر لی۔ شوق نے مزید انگیخت کی تو پی ایچ ڈی کر کے ادبی ڈاکٹر بھی بن گئے۔ ان کے فن اور فکر اور شخصیت پر ہندوستان کی تین یونیورسٹیوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ ان کی ادبی سخاوت کا عالم یہ ہے کہ اپنے کئی طالب علموں کو پی ایچ ڈی کرا چکے ہیں۔ ان کی اس خوبی کا اعتراف بھی ضرور ہے کہ وہ پاکستان کے ادب اور ادیبوں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کے ادیبوں میں پیریٹی قائم رکھتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ انہوں نے ایک کتاب گوپی چند نارنگ پر لکھی تو اس کے ساتھ ہی ایک کتاب ڈاکٹر وزیر آغا پر بھی لکھ ڈالی۔ ڈاکٹر وزیر آغا پر ہندوستان میں پی ایچ ڈی کا پہلا مقالہ انہوں نے ہی لکھوایا تھا۔ پھر خیال آیا کہ انور سدید کو کیوں نظر انداز کیا جائے۔ اور اس پر بھی ایک طالب علم کو پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے پر لگا دیا اور بالآخر اسے بھی ڈگری دلا دی۔ ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کی دوہا نگاری پر بھی ایک کتاب لکھ چکے ہیں۔ میری کتاب ''سفر جاری ہے'' چھپی تو اس کو بڑی کشادہ دلی سے سراہا اور جب انہیں معلوم ہوا کہ اس پر پروفیسر جمیل آذر کتاب لکھ رہے ہیں تو انہیں بھی تاؤ آ گیا اور اطلاع دی کہ جمیل آذر سے پہلے وہ کتاب لکھیں گے۔ اسی دوران ساحر لدھیانوی پر اظہر جاوید صاحب کی کتاب چھپ گئی تو وہ اس کی تحسین میں معروف ہو گئے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی شخصیت اور کارناموں پر نو کتابیں چھپ چکی ہیں۔ وہ دنیا کے واحد ادیب ہیں جن کی ہندوستان کے ایک شاعر نے منظوم کتاب لکھی ہے۔ کم از کم نصف درجن رسائل نے ان پر خصوصی گوشے چھاپے ہیں۔

مناظر عاشق ہرگانوی ''کوہسار جرنل'' کے نام سے ایک ادبی رسالہ بھی چھاپتے ہیں جس پر مختلف اصنافِ ادب پر تجربات کا سلسلہ جاری ہے۔ ہندوستان کے کئی ادبی رسائل مضامین نظم و نثر کے انتخاب میں ان سے مشورہ کرتے ہیں۔ گویا ان رسائل میں انہیں پس

پردہ مدیر کی حیثیت حاصل رہتی ہے لیکن منکسر مزاج اور وسیع القلب اتنے ہیں کہ اس کا کریڈٹ نہیں لیتے۔ تاہم تین درجن رسائل کے ایڈیٹوریل بورڈوں میں ان کا نام شامل نظر آتا ہے۔ اور وہ ان کی مشاورت میں شامل نظر آتے ہیں۔ ماشاءاللہ۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی شاعر ہیں، افسانہ نگار ہیں اور سب سے اہم یہ کہ نظریہ ساز نقاد بھی ہیں۔ ہندوستان سے چھپنے والی تنقیدی کتابوں میں ان کے نظریاتی حوالے سب سے زیادہ نظر آتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو ادب کی سب اصناف میں مشاہیر اور معاصر ادیبوں پر مقالے لکھے ہیں۔ اور ادب میں غیر جانبداری کی مثال قائم کی ہے۔ سب لوگ ان کی دوست نوازی کی تحسین کرتے ہیں۔

ادب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا اوڑھنا بچھونا ہے اور فروغ اردو ان کی زندگی کا ایک مقدس مشن ہے۔ وہ اس مشن کی تکمیل کے لئے پورے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کا سفر کر چکے ہیں۔ کئی سیمیناروں میں مقالے پڑھ چکے ہیں۔ مشاعروں میں دور دور تک بلائے جاتے ہیں۔ ایک سفر لندن کا بھی کر چکے ہیں۔ واپس آئے تو بے حد خوش تھے کہ وہ لندن میں اردو کی ایک بستی قائم کر آئے ہیں۔

مناظر عاشق ہرگانوی اس لحاظ سے بھی خوش قسمت ہیں کہ انہیں ہندوستان کے دو درجن سے زائد ناشروں کا تعاون حاصل ہے۔ ان کی بہت سی کتابیں پہلی جماعت سے ایم اے تک کے نصاب میں شامل ہیں۔ اور طلباء کو ان کا نام اسی طرح یاد ہے جس طرح پریم چند، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کا۔ مجھے مناظر عاشق ہرگانوی سے ملنے کا شرف حاصل نہیں ہوا لیکن ٹیلی فون پر بات چیت کا موقع کئی مرتبہ مل چکا ہے۔ فون اٹھاتے ہی پہلے پوچھتے ہیں کہ مقبول اکیڈمی سے نئی کتابیں کون کون سی چھپی ہیں۔ کتابوں کے نام بتاؤں تو پوچھتے ہیں کہ ان میں کون کون سے مضامین شامل ہیں۔ اب کچھ عرصے میں افسوس کرنے لگے ہیں کہ دونوں ملکوں میں ڈاک کی شرح بہت بڑھا دی گئی ہے اور کتابوں کی آمد و رفت کم ہو گئی ہے۔ لیکن دوسری طرف اطمینان کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ اب ادب الیکٹرانک میڈیا پر بھی دستیاب ہونے لگا ہے اور دونوں ملکوں میں کئی لوگوں نے "دیب

سائیٹس'' (Web Sights) کھول رکھی ہیں۔ لیکن وہ پرنٹ میڈیا کے زیادہ حامی ہیں اور کہتے ہیں کہ جو مزا کتاب پڑھنے اور محفوظ رکھنے میں آتا ہے وہ انٹرنیٹ پر کتاب رسالہ پڑھنے سے نہیں آتا۔ ان کے ذوق وشوق کو دیکھ کر میں کہہ سکتا ہوں کہ اُردو کے ان جیسے دیوانے کم ہیں میں نے ان کا نام اپنی ریکارڈ بک میں درج کر رکھا ہے۔ اللہ ان کا زورِ قلم زیادہ کرے۔

............☆☆............

ڈاکٹر منصور احمد باجوہ

ڈاکٹر منصور احمد باجوہ اپنی سرکاری زندگی میں بڑے ہموار انسان نظر آتے ہیں اور ان کی اصول پرستی بھی ضرب المثل ہے لیکن جب زندگی کی ناہمواریوں پر اور معاشرے کی ناگوار حرکتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی تنقیدی حس بدل جاتی ہے اور عینک کا زاویہ بھی ٹیڑھا ہو جاتا ہے وہ معاشرے کو طنز ناک نظر سے دیکھتے ہیں اور مزاح پیدا کرتے ہیں جو پڑھنے والوں کو فطری نظر آتا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مشتاق احمد یوسفی اردو ادب کے آخری مزاح نگار ہیں لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ یوسفی صاحب کے پہلو بہ پہلو مزاح کا ایک منفرد اسلوب ڈاکٹر منصور احمد باجوہ نے بھی پیدا کر رکھا ہے جس کے وہ خود ہی بانی ہیں اور اس کے منتہی بھی ان ہی کو قرار دینا چاہئے۔ آگے بڑھنے سے پہلے میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ کو ان کی زندگی کے بارے میں چند باتیں بتا دوں۔

منصور احمد باجوہ اس سال پیدا ہوئے جب پاکستان کرۂ ہند میں قانونی طور پر تشکیل دیا جا رہا تھا۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ان کا سال پیدائش 1947ء ہے اور ان کی عمر پاکستان کی عمر کے برابر ہے اور اس کے ساتھ ہی بڑھ رہی ہے۔ اس سال پیدائش کے اثرات یہ ہیں کہ منصور احمد باجوہ تعمیر میں یقین رکھتے ہیں تو تخریب کا قلع قمع کرنے میں بھی گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ معاشرے کی تخریب کاری ہی ان کے دل

میں ردعمل پیدا کرتی ہے اوران کے عمل کا قدم تعمیر کے مثبت راستے پر چل نکلتا ہے۔ امیر لوگ منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوتے ہیں غریب لوگ کسی قسم کے چمچے کے بغیر ہی پیدا ہو جاتے ہیں۔ منصور احمد باجوہ پیدا ہوئے تو ان کے ہاتھ میں قلم تھا۔ چنانچہ انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی لکھنا شروع کر دیا اور سرکاری ملازمت سے باعزت طور پر ریٹائر ہو گئے ہیں تو اب بھی لکھ رہے ہیں۔ تھوڑا سا فرق ہے تو یہ کہ سرکاری ملازمت کے درمیان دفتر کے چیکوں پر لکھتے تھے، اب سفید کاغذ پر لکھتے ہیں اور اتنے خوشخط ہیں کہ ان کا لکھا ہوا سفید کاغذ بھی کرنسی نوٹ کی طرح بھنایا جا سکتا ہے۔

باجوہ صاحب کی پیدائش رحیم یار خاں میں ہوئی جو جنوبی پنجاب کا مشہور ضلع ہے لیکن انہوں نے تعلیم کی طرف قدم بڑھایا تو رحیم یار خاں سے نکل گئے اور لاہور پہنچ گئے انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے انتظامیات اور صحافت کیا۔ ایل ایل بی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے اور پی ایچ ڈی بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے کیا۔ گویا انہوں نے تین یونیورسٹیوں کے گھاٹ کا پانی پیا اور بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کیں لیکن علم کی پیاس اب بھی باقی ہے اس لئے زیادہ وقت لائبریری میں گزارتے ہیں۔ میں نے لاہور میں ہر وقت ناشروں میں گھرے ہوئے دیکھا اور سمجھ گیا کہ وہ کتابوں کی بجائے کتابیں چھاپنے والوں کو پڑھتے ہیں اور یہ بات غلط نہیں ڈائریکٹر جنرل لائبریریز کی حیثیت میں وہ ناشرین کی نفسیات پڑھتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ کمیشن حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے ڈائریکٹروں سے ان کا امتیازی وصف یہ ہے کہ طے شدہ کمیشن کی کٹوتی سرکاری بل میں سے کراتے ہیں اور اس کمیشن کے عوض مزید کتب خرید لیتے ہیں۔ دوسرے لوگ کمیشن کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں اس کا بتانا خوف فسادِ خلق کے تحت مناسب نہیں۔ ان سے ملنے والے کہتے ہیں کہ وہ افسر ہیں لیکن ان کے فقر کی شان زیادہ ہے۔ سیاحت اور سیر ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ وہ پاکستان کے کونے کونے کو دیکھ چکے ہیں۔ سعودی عرب اور خلیج کی ریاستوں کی سیاحت بھی کر چکے ہیں لیکن ان کی نظر میں "اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے" وہ پاکستان کو عالی شان کہتے ہیں اور اس کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر منصور احمد باجوہ اپنے لکھے ہوئے کو ضائع نہیں کرتے بلکہ خلق خدا کے مطالعے کے لئے انہیں کتابوں کی صورت میں چھپوا دیتے ہیں۔ ان کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''روپ بہروپ'' کے نام سے چھپا تھا۔ اس کے بعد دو کتابیں ''ضمیر برائے فروخت'' اور ''کلام بے لگام'' جیسی کتابیں آئیں۔ ''نکتہ درازیاں'' میں طنزیہ و مزاحیہ مقولے اور ایک سطری اقوال وغیرہ درج کئے گئے ہیں۔ یہ کتابیں دکھی انسانیت میں مسکراہٹیں بکھیرتی ہیں اور لوگوں کو اپنے غم بھول جانے کی ترغیب فطری انداز میں دیتی ہیں۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ باجوہ صاحب کے مضامین انسان کے باطن میں نفسیاتی گدگدی پیدا کرتے ہیں اور یہ مسکراہٹوں کا سرچشمہ ہیں۔ کھانے کے بعد ان کے مضامین پڑھیں تو کھانا جلد ہضم ہو جاتا ہے اور انسان معاشرے کے صحت مند کام کرنے کے لئے مثبت انداز اختیار کر لیتا ہے۔ اب مناسب ہے کہ ان کی ایک نظم بھی پڑھ لیجئے۔

نہ مرہم دل پہ رکھتا ہے نہ وہ غم خوار ہوتا ہے
جو رشتہ دار ہے، بس وہ تو رشتہ دار ہوتا ہے

یقیں محکم، عمل پیہم، خوشامد فاتح عالم
جہاد زندگانی میں یہی درکار ہوتا ہے

وہ مرد ناتواں باہر جو اک ملزم سا لگتا ہے
وہ گھر میں سامنے بیوی کے تھانیدار ہوتا ہے

گیا وہ وقت جب وہ سب سے پہلے سر کٹاتے تھے
جھکائے سر کو جو پہلے وہ اب سردار ہوتا ہے

فرائض دو ہی ہیں اس کے جو سرکاری ملازم ہے
ذلیل و خوار کرتا ہے، ذلیل و خوار ہوتا ہے

نگہباں کی کوئی حاجت نہ ڈر میلی نظر کا ہے
بڑھاپا جانِ من خود اپنا پہرے دار ہوتا ہے

ہے مرتا موت سے پہلے ریٹائر ہو کے ہر افسر
نکل جاتی ہے جب خوشبو تو گل بے کار ہوتا ہے

منصور احمد باجوہ ان دنوں ''کنارے کنارے'' کے نام سے اخبار ''پاکستان'' میں کالم لکھ رہے ہیں اور سرکاری افسری کو خیر باد کہہ چکے ہیں۔

☆☆

منصور احمد بٹ

منصور احمد بٹ کا تعلق ادب کے اس قبیل سے ہے جو ادب کی ہر سمت کی رہ نوردی کرتے ہیں۔ انہوں نے ابتدا ۱۹۷۹ء میں بچوں کی ناول نگاری سے کی اور یوں بچوں کے لیے بے شمار کتب لکھیں۔ پہلی بار ۱۹۸۵ء میں صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور بچوں کے ایک رسالے ننھے شاہین کی ادارت سنبھالی۔ اس وقت ان کی عمر ۲۲ برس تھی۔ موصوف دیکھنے میں دبلے پتلے اور منحنی سے انسان ہیں اور قد ماشاء اللہ طویل پایا ہے۔ عاجزی و انکساری کا مرقع ہیں۔ ۱۹۸۵ء ہی میں تحقیق کا شعبہ منتخب کیا، پھر مرحوم وزیر اعلیٰ پنجاب جناب غلام حیدر وائیں کے ایماء پر مسلم لیگ پر ایک جامع اور مربوط کتاب لکھی جو تحریک پاکستان کے مستحکم حوالے پر مربوط ہے۔

تحریک پاکستان کی فکری اور نظریاتی بنیادوں پر یقین محکم رکھنے والوں میں ایک معتبر نام منصور احمد بٹ کا ہے۔ جنھیں اس ملک کا ماضی و حال ہی نہیں محفوظ مستقبل بھی غایت درجہ عزیز ہے۔ ان کا اسلوب نگارش ادیبانہ بھی ہے اور صحافیانہ بھی اور مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے بہت کم عرصہ میں تحریک پاکستان اور سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر لکھنے والوں میں اپنا نام پیدا کر لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں مزاح پر بھی دسترس دے رکھی ہے۔ ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۷ء تک ان

کے فکاہیہ سیاسی کالم ہفت روزہ فیملی میگزین میں بھی شائع ہوتے رہے۔ انہوں نے اپنی صحافتی زندگی میں بہت سے رسائل اور اخبارات میں کام کیا۔ جن میں بچوں کی دنیا، ننھے شاہین، پیام، نکھار، ذہین، پہچان اور مغرب ٹائمز شامل ہیں۔

حکومت پاکستان نے انہیں ان کی کئی کتب پر ایوارڈز سے نوازا۔ انہیں چار کتب پر صدارتی ایوارڈ مل چکے ہیں، جبکہ چھ کتب پر ستائشی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

منصور احمد بٹ بلوچستان کے ایک دور افتادہ علاقے مستونگ میں ۳۰ مئی ۱۹۶۳ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سبی، زیارت اور لاہور سے حاصل کی۔ ۱۹۷۳ء میں لاہور ہجرت کی۔ پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلم میں روانی اور خیالات میں طولانی دی ہے۔ لکھنے بیٹھتے ہیں تو لکھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ صحت کی طرف سے ان کا ہاتھ تنگ ہے مگر دل کے وسیع ہیں۔ لکھنا ہی ان کا اوڑھنا اور بچھونا ہے۔ اپنے حلقہ احباب میں خوش مزاج وخوش گفتار انسان کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ بڑے حساس اور رحم دل انسان ہیں۔ اپنا پورا وقت قلمکاری میں ہی صرف کرتے ہیں۔ مقبول اکیڈمی نے بھی ان کی کئی کتب شائع کی ہیں۔ ان کی باتوں اور قلم میں بڑی لطافت پائی جاتی ہے۔

انہیں سب سے پہلا ایوارڈ مقبول اکیڈمی کی ایک کتاب ''نیل کنول'' پر ملا۔ دوسرا ایوارڈ بھی مقبول اکیڈمی کی کتاب ''نامور مسلمان سائنسدان'' پر ملا۔ اتنے ایوارڈ ملنے کے باوجود ان میں غرور وتکبر نام کو نہیں۔ انہوں نے اپنے ادبی سفر میں سینکڑوں کتب تحریر کیں جن پر داد بھی وصول پائی۔ شعبہ تعلیم میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ ششم اور ہفتم کی کتب تحریر کیں۔ پی سی ایس اور سی ایس ایس کی کتب بھی لکھیں۔

ان میں ایک بات ہے کہ یہ کبھی سوچ کر نہیں لکھتے، اور لکھتے ہوئے کبھی سوچتے نہیں۔ بس کاغذ اور قلم سنبھالا اور لکھنے کے سفر میں روانہ ہو گئے۔ راستے میں کہیں پڑاؤ نہیں کیا۔ بے تکان اس سفر پر چلتے ہی چلے جاتے ہیں اور منزل مراد پر ہی پہنچ کر دم لیتے ہیں۔ ان کی

باتوں میں بھی دل نشینی اور مزاح کا عنصر پایا جاتا ہے۔ بات کرتے ہیں بڑے دھیمے انداز میں جو اثر پذیر ہوتی ہے۔ کبھی لگی لپٹی سے کام نہیں لیتے۔ ہر بات میں کوئی لطیفہ یا شعر ضرور شامل کر دیتے ہیں۔ جس سے بات کی افادیت اور بڑھ جاتی ہے۔ قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا ہے اور وزن چند پونڈ۔ اکثر کہا کرتے ہیں جب تیز ہوا چلتی ہے تو میں اپنی جیبوں میں وزن ڈال لیتا ہوں مبادا اُڑ نہ جاؤں۔ تنقید کرنے پر آئیں تو اپنی ذات کو بھی نہیں بخشتے۔ خود پر ایک فکاہیہ کالم ''بٹ دھرمیاں'' لکھا ایک دوست نے کہا ''یہ آپ نے کیا غضب کر دیا اپنی ہی ذات کو ہدف تنقید بنا ڈالا۔'' یہ سن کر بڑی معصومیت سے بولے ''خود پر تنقید کرنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ ذرا سوچئے جو شخص تنقید کرتے ہوئے اپنی ذات کو معاف نہیں کرتا جب وہ کسی دوسرے پر تنقید کرے گا تو اس کا کیا حشر کرے گا۔''

انہوں نے بالکل سچ کہا۔ یہ بڑی خوفناک بات ہے، مگر اس کے باوجود یہ کسی پر تنقید نہیں کرتے۔ یہ تو ازراہِ تفنن کہہ دیا تھا۔ آج تک ان کی ذات سے کسی کو دکھ نہیں پہنچا۔ ہر ایک کی دل آزاری سے ہمیشہ اجتناب کیا۔ اگر کسی کی بات بری بھی لگی تو حرف شکایت زبان پر نہیں لائے۔ خاموشی کو وطیرہ بنائے رکھا اور کبھی کوئی بات دل میں نہ رکھی۔ ان کے دوستوں کا حلقہ تو وسیع ہے ہی، دشمنوں کے متعلق ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ ایک بار ان سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو مسکرا کر بولے ''میں نے دوست ہی ایسے رکھے ہیں کہ دشمنوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔''

ان کا دشمن شاید ہی کوئی ہو اور دوست سب ہی ہیں، جن سے ایک بار مل لیتے ہیں وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ اکثر کہا کرتے ہیں ''دنیا میں دو طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ ایک وہ جن سے لوگ ملنے سے کتراتے ہیں اور دوسرے وہ لوگ جن سے ملنے کے لیے لوگ بے چین رہتے ہیں۔ کوشش کرنی چاہیے تعلق دوسرے قبیل سے رہے۔'' اس سے اچھی بات اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ اپنی تعریف سن کر سر جھکانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ لگتا ہے

ابھی سرزمین سے جا لگے گا۔ مجھے ان سے بڑی محبت ہے۔ بڑے ادب اور انکساری کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ کبھی کسی بات پر تکرار یا بحث نہیں کرتے۔ اپنی زندگی کی نصف سنچری گزار چکے ہیں، مگر اب بھی ایسا لگتا ہے کہ جوان ہی ہیں۔ کہا کرتے ہیں کہ میں ہر سال کیلنڈر کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو جاتا ہوں۔ ادب کی کوئی ایسی صنف نہیں جس میں طبع آزمائی نہ کی ہو۔ مگر پھر بھی خود کو ادیب نہیں مانتے۔

کشمیری فیملی سے تعلق ہے، مگر صحت سے کشمیری لگتے نہیں۔ کھاتے کم اور لکھتے زیادہ ہیں۔ اپنی صحت کی طرف سے ہمیشہ لاپرواہی برتتے ہیں۔

منصور احمد بٹ بحیثیت انسان، علم دوست، ادب دوست اور انسان دوست ہیں۔ اللہ ان کے قلم کی روانی جاری رکھے۔ آمین

ان کی معروف کتب میں چند ایک یہ ہیں:

پیارے نبی کا پیارا بچپن، پیارے نبیؐ کا پیارا عہد شباب، پیارے نبیؐ کے پیارے والدین، پیارے نبیؐ کے پیارے سفر، پیارے نبیؐ کے پیارے خطوط، پیارے نبیؐ کے پیارے معاہدے، پیارے نبیؐ کے پیارے فیصلے، پیارے نبیؐ کے غزوات، معجزاتِ رسولؐ کا انسائیکلوپیڈیا، قائداعظم کا بچپن، قائداعظم کے آخری دو سال، حیات قائداعظم، محمد علی جناح، غزواتِ اسلام، پتھروں کی بارش، شیطان کی سازش، سفید گھوڑوں کا لشکر، خون آلود چٹانیں، چاند کی گواہی، ہبل کے پجاری، لوہے کا آدمی، عشق رسولؐ، اس کے علاوہ بیسیوں اور کتب ہیں۔

☆☆
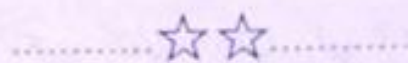
منور عثمانی

منور عثمانی نے یہ مقولہ کہ ''جس نے لاہور نہیں دیکھا' وہ پیدا ہی نہیں ہوا'' بہاولپور میں اس وقت سنا جب وہ اس ڈویژن کی اسلامیہ یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری لے چکا تھا۔ اور اس نے لاہور نہیں دیکھا تھا۔ رات کو سوتا تو اسے خواب آتے ''لاہور دیکھو اور اپنی پیدائش کا سرٹیفکیٹ حاصل کرلو''۔ آخر ایک دن رخت سفر باندھ لیا اور لاہور آ گیا۔ آتے ہی لاہور سے مصافحہ کیا اور سلام عقیدت کے لئے داتا گنج بخش پہنچ گیا۔ سرکلر روڈ سے مقبول اکیڈمی کے سامنے سے ایک خوبصورت نوجوان نے سرائیکی لہجے میں مجھ سے داتا دربار کا راستہ پوچھا۔ میں نے کہا ''سیدھے چلتے جاؤ۔ داتا صاحب کا دربار خود ہی تمہیں نظر آ جائے گا''۔ منور عثمانی داتا صاحب کے دربار پر سلام پیش کر کے واپس مقبول اکیڈمی پر آیا تو کہہ رہا تھا ''نئے ریساں شہر لاہور دیاں'' ...... میں نے چائے پیش کی تو کتابوں کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا کہنے لگا میں بہاولپور سے آیا ہوں یہاں ادیبوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ مشورہ دیں کس کس سے ملوں اور ان کے پتے بھی بتائیں''۔ میں نے سب سے پہلے احمد ندیم قاسمی کا نام لیا اور دفتر ''فنون'' میں محفل کا راستہ بتایا۔ دیگر ادیبوں میں ڈاکٹر وزیر آغا، شہزاد احمد، انور سدید، اظہر جاوید، اے حمید، غلام الثقلین نقوی، یونس جاوید وغیرہ کے نام لئے اور ان کے پتے بھی بتائے۔ کچھ عرصے کے بعد پتہ چلا کہ منور عثمانی نے

لاہور میں ہی آباد ہونے کا فیصلہ کر لیا اور لاہور نے بھی اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ وہ شہر کے سب سے پرانے اسلامیہ کالج میں اردو لیکچرار کے عہدے پر فائز ہو گیا۔ اب وہ لاہور کے بہت سے ادیبوں سے مل چکا تھا۔ ہر ایک کے بارے میں اپنی رائے بنا چکا تھا۔ لیکن وزیر آغا سے عقیدت پیدا کر لی تھی۔ ہر شام موٹر سائیکل چلاتے ہوا سرور روڈ پہنچ جاتا جہاں اس کی ملاقات انور سدید، شاہد شیدائی، سجاد نقوی، شناور اسحاق، اقدار جاوید، ونگ کمانڈر صوفی اور کئی لوگوں سے ہوئی۔ اہم بات یہ ہے کہ اس کے دل میں انشائیہ کا بیج بویا گیا۔ ایک دن دیکھا تو منور عثمانی کا انشائیہ رسالہ ''اوراق'' میں چھپا ہوا تھا جس کی تعریف ''اوراق'' کے اگلے شمارے میں بھارت کے مشہور افسانہ نگار جوگندر پال نے کی۔ ایک نقاد نے رائے دی کہ منور عثمانی کا انشائیہ افسانے کی دائیں پسلی سے پیدا ہوا ہے۔ اور اب میں کہہ سکتا ہوں کہ منور عثمانی جو دروازوں اور فصیلوں کے پھیلتے ہوئے شہر میں ایک اجنبی کی طرح داخل ہوا تھا اب نہ صرف لاہوری کہلا سکتا ہے بلکہ وہ دبستان لاہور کا ایک اہم مصنف بھی ہے۔ جس کی تین کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اب منور عثمانی اردو پڑھاتے ہیں۔ اردو لکھتے ہیں لیکن جب بولتے ہیں تو جنوبی پنجاب کی رس بھری زبان سرائیکی بولتے ہیں ان کا پورا نام منور مقبول عثمانی ہے۔ گویا میرا آدھا نام ان کے نام میں شامل ہے۔ میں نے پوچھا ''مقبول'' لکھنا کیوں ترک کر دیا کہنے لگے ''میں نے آپ کے نام سے مقبولیت کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا اور پھر مختصر نام میں روانی ہے۔ ادبی لحاظ سے یاد رکھنا آسانی ہے''۔

میں نے اس دلیل کو کافی سمجھا۔ اور ان کی انفرادیت پسندی کی داد دی۔

منور عثمانی نے انشائیہ کا بیج پالنے سے پہلے اردو طنز و مزاح سے محبت پیدا کی۔ ان کے محبوب مصنف رشید احمد صدیقی ہیں اور رشید صدیقی اس لئے پسند ہیں کہ ان کا مزاح صرف مسکرانے کی دعوت دیتا ہے۔ دانت دکھانے کا موقع پیدا نہیں کرتا۔ نہ قہقہہ پیدا کرتا ہے۔ وزیر آغا سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے انشائیہ لکھنے کا مشورہ دیا۔ اور ان کے ساتھ کئی محفلوں میں انشائیہ کے فن پر گفتگو کرتے رہتے تھے۔ ان باتوں اور ملاقاتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ

منور عثمانی نے ایک کتاب ''رشید احمد صدیقی کے انشائی تیور'' کے نام سے لکھی۔

اور اس ممتاز مزاح نگار کی تحریروں سے انشائیوں کے ٹکڑے دریافت کئے جو چیزوں کا ذاتی مشاہدہ اور نیا زاویہ پیش کرتے تھے۔ مختلف انشائیوں کے دوران ہی انہوں نے دیکھا کہ ''سفر'' انشائیوں کا اہم موضوع ہے۔ وہ خود بھی بہاولپور اور لاہور کے درمیان اکثر سفر میں رہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے انشائیوں کی ایک کتاب ''سفر راستہ بتاتا ہے'' لکھی جو اردو انشائیوں کا ایک انوکھا انتخاب ہے۔ منور عثمانی کے اپنے انشائیوں کی کتاب ''فرنٹ سیٹ'' کے نام سے چھپ چکی ہے۔ منور عثمانی اُردو انشائیہ کے اس تصور کو فروغ دے رہے ہیں جو ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، غلام جیلانی اصغر اور پروفیسر جمیل آذر نے متعارف کرایا ہے۔

منور عثمانی کے لئے 4 ستمبر 2010ء کا دن بڑا المناک تھا۔ اس دن ان کے ادبی رہنما اور محسن ڈاکٹر وزیر آغا کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد وفات پا چکے تھے اور پوری ادبی دنیا کو سوگوار کر گئے تھے۔ ان کی میت تدفین کے لئے لاہور سے وزیر کوٹ لائی گئی تھی۔ منور عثمانی اپنے دوست شاہد شیدائی اور شنا اور اسحاق کے ساتھ وزیر کوٹ پہنچے۔ اور سینکڑوں سوگوار لوگوں کے ساتھ وزیر آغا صاحب کو زیر لحد سلا دیا۔ اس کے بعد کئی دنوں تک منور عثمانی غم زدہ رہے۔ دیدۂ نم سے کہتے کہ ادب کا ایک بڑا محسن دنیا سے اٹھ گیا۔ شاہد شیدائی نے ان کا غم غلط کرنے کے لئے انہیں کہا کہ وزیر آغا صاحب پر ایک مضمون لکھ دیں۔ یہ مضمون رسالہ ''کاغذی پیرہن'' میں شائع ہو گیا ہے اور اب تک وزیر آغا پر جو کچھ شخصی زاویوں سے لکھا گیا ہے ان میں یہ مضمون خاص مقام رکھتا ہے۔ میں منور عثمانی کو دوستوں کا سچا دوست سمجھتا ہوں وہ واحد ادیب ہے جس کا لاہور میں کوئی دشمن نہیں۔ واہ منور عثمانی واہ!

☆☆

ناصر بشیر

ناصر بشیر کو میں ایسے ادیبوں میں شمار کرتا ہوں جو گوناگوں خوبیوں کا مالک ہونے کے باوجود انا پرستی کے مرض میں مبتلا نہیں ہوئے۔ وہ جس کسی سے ملتے ہیں اسے اپنی شائستگی کا اسیر بنا لیتے ہیں۔ قیاس غالب یہ ہے کہ ناصر بشیر اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتے ہیں لیکن زبان ضرورت کے وقت کھولتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل میں زندگی کے تجربے اور مشاہدے بڑی کثرت سے ملتے ہیں۔

اس کی یہ عادت بھی بہت اچھی ہے کہ جس کسی سے ربط و تعلق پیدا کرتے ہیں اسے روز بروز مضبوط کرتے جاتے ہیں اور ملاقات نہ بھی ہو تو اپنا رابطہ ای میل اور موبائل فون سے قائم رکھتے ہیں۔ اور اخبار ''پاکستان'' میں کالم لکھتے ہیں۔ ان کا کالم بالعموم ادبی ہوتا ہے اور وہ ادیبوں کی خبروں کو ہی اہمیت نہیں دیتے بلکہ ان کے مسائل پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اور متعلقہ حکام سے ان کا حق حاصل کرنے کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب خود انہیں کوئی کام آ پڑے تو کسی ادیب سے مدد کی توقع نہیں کرتے۔ ایک مثال یہ ہے کہ ناصر بشیر کی گریڈ اٹھارہ میں ترقی ہوئی تو اسے لاہور بدر کر کے شاہ کوٹ میں پوسٹ کر دیا گیا۔ یہ حکم دراصل ناصر بشیر کو ادب سے خارج کرنے کے مترادف تھا لیکن انہوں نے سرکاری اداروں کے اہلکاروں کے مطالبے ماننے سے انکار کر دیا اور مشکلات کا سامنا خود کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ناصر بشیر نے گزشتہ کئی سال ادیبوں شاعروں، صحافیوں، پروفیسروں اور دانشوروں کے لئے ایک نیوز سروس جاری کر رکھی ہے۔ ایک ہزار کے لگ بھگ لوگوں کے ٹیلی فون نمبر ان کے پاس محفوظ ہیں۔ اِدھر کوئی واقعہ ہوتا ہے اُدھر ناصر بشیر اسے اپنی نیوز سروس پر ساری دنیا میں پھیلا دیتا۔ اخبار حتیٰ کہ ریڈیو اور ٹی وی پر بھی خبر بعد میں آتی ہیں۔ بلکہ ایک پروڈیوسر نے تو مجھے بتایا کہ ان کا ٹیلی وژن چینل ''ادبی خبریں'' ناصر بشیر صاحب سے ہی حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر امجد ثاقب صاحب نے فرمایا کہ یہ سروس بی بی سی سے بھی آگے نکل گئی ہے''۔ ڈاکٹر صغریٰ صدف نے اسے ''جیو سروس'' کہنا شروع کر دیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس سروس نے اہل قلم کو ایک لڑی میں پرو رکھا ہے۔ حال ہی میں جب اظہر جاوید کا اچانک حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا تو اس کی خبر ناصر بشیر نے ہی لوگوں کو دی یہ اچھی خبر نہیں تھی۔ لیکن یاد رہے کہ اظہر جاوید کو پرائیڈ آف پرفارمنس ملنے کی خبر بھی سب سے پہلے ناصر بشیر نے ہی نشر کی تھی۔

ناصر بشیر 1968ء میں ملتان میں پیدا ہوئے۔ بی اے تک تعلیم کے مراحل اولیاؤں کے اس شہر میں ہی طے کئے اور گورنمنٹ کالج کے میگزین ''نخلستان'' کی ادارت بھی کی۔ اردو اکادمی ملتان کے ہفتہ وار جلسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے اور اپنی غزلیں تنقید کے لئے پیش کرتے۔ وہ ڈاکٹر عرش صدیق کو ''بابائے ملتان'' شمار کرتے ہیں۔ ان کی نیاز مندی کا دائرہ وسیع تھا اور وہ ارشد ملتانی، اے بی اشرف، انوار احمد، عبدالرؤف شیخ، شمیم ترمذی، اقبال ساغر صدیقی سب کا ذکر بڑی محبت اور عقیدت سے کرتے ہیں۔ اور اپنے دوستوں میں سے اطہر ناسک کی بہت تعریف کرتے ہیں جو ان کی تعلیمی زندگی میں روشنی دکھاتے رہے۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ ملتان یونیورسٹی نے اپنے شہر کے اس ہونہار سپوت کو ایم اے اُردو میں داخلہ نہیں لینے دیا۔ وہ مایوس ہو کر فیصل آباد آ گئے پروفیسر ریاض مجید انہیں ان کی شاعری کے حوالے سے جانتے تھے۔ انہوں نے اسے گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں

ایم اے کی کلاس میں داخل کرا دیا۔ اور فکر معاش سے آزاد کرنے کے لئے روزنامہ ''عوام'' میں اٹھارہ سو روپے ماہانہ کی نوکری دلا دی۔ ناصر بشیر نے ایم اے کا امتحانی مقالہ ڈاکٹر وزیر آغا کے ہم عمر بھانجے شمس آغا کی افسانہ نگاری پر لکھا جو عنفوان شباب میں زندگی کے منظر سے غائب ہو گئے تھے۔ وزیر آغا صاحب نے اس مقالے کی بہت تعریف کی اور آغا امیر حسین نے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔

ناصر بشیر کے لئے فیصل آباد چھوٹا شہر ثابت ہوا۔ وہ اونچی اڑان کے لئے لاہور آ گیا۔ یہاں اس نے مشاعرے پڑھے ادبی حلقوں میں حاضری دی اور سب سے اہم یہ کہ روزانہ ''پاکستان'' میں ادبی صفحہ مرتب کرنے لگے اور اس کے ساتھ ہی کالم لکھنے لگے۔ اور خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے اس اخبار سے اپنی نسبت قائم رکھی۔ حالاں کہ اس کے مالک تبدیل ہوتے رہے تھے۔

ناصر بشیر کی شادی 13 فروری 2000 کو اپنی خالہ زاد شبنم سے ہوئی جو ایم اے اُردو کر چکی ہیں اور غزل کا اچھا ذوق رکھتی ہیں۔ ناصر بشیر غزلیں خود کہتے ہیں لیکن ان کی بیگم بچوں کی صورت میں غزلیں بناتی ہیں۔ گزشتہ بارہ سال کے عرصے میں چار بچے پیدا کئے۔ لیکن ناصر بشیر نے چار دیوان شائع نہیں کئے۔ گویا وہ تخلیقی عمل میں بیگم سے مات کھا گئے ہیں۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ اس شکست میں ''فتح'' کے تمام آثار موجود ہیں۔ کیوں کہ انہوں نے چار شاعر پیدا کئے ہیں۔ ایک دن ان کے دوست نے ناصر بشیر کے منجھلے بیٹے کو روتے دیکھا تو فوراً ''ارے'' یہ تو روتا بھی وزن میں ہے'' اس کی رُوں رُوں بحرِ متقارب میں ہے۔ ناصر بشیر نے اس لطیفے کا خوب مزا لیا۔

ناصر بشیر میرا روز کا ملاقاتی ہے۔ کیفیت یوں ہے کہ جب وہ اپنے کالج جاتا ہے تو مقبول اکیڈمی کے سامنے والی سڑک سے گزرتا ہے۔ مجھے بیٹھا ہوا دیکھے تو اکیڈمی کے اندر آ جاتا ہے اور سلام میں ہمیشہ پہل کرتا ہے۔ ایک دن ایک شاعر نے کہا کہ ناصر بشیر کا قد پونے پانچ فٹ ہے۔ میں نے جواب دیا...... ''غلط! بالکل غلط، اس کا قد ساڑھے نو فٹ

ہے۔ وہ جتنا اوپر نظر آتا ہے اتنا ہی زمین کے اندر ہے"۔

جس دن امریکہ میں افتخار نسیم فوت ہوا اس دن لوگوں نے دیکھا کہ ناصر بشیر دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا کہ میرا مونس، میرا ہمدم، میرا دمساز دنیا سے گزر گیا ہے۔ اور پھر اگلے ہی لمحے وہ اپنی نیوز سروس پر ایس ایم ایس کرنے لگے۔

☆☆
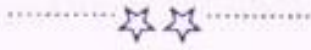
ندیم اُپل

ندیم اُپل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ صرف دوسروں کے بارے میں جانتے ہیں اور خوب جانتے ہیں مگر اپنے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے جس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے ان کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ ندیم اُپل پچھلے 33 سال سے قلم کی مزدوری کر رہے ہیں، مگر انہوں نے اڈے کا مزدور بننے کی کوشش نہیں کی۔ انہیں ہمیشہ بڑے بڑے اخبارات ورسائل اور اشاعتی اداروں نے خود پیشکش کی اور انہوں نے جواب میں پوری آزادی اور ضمیر کی آواز پر شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ مگر ندیم اپل کسی کام کی یکسانیت اور اس میں آنے والے جمود سے اکتا جاتے ہیں تو قافلہ اگلی منزل کی جانب روانہ ہو جاتا ہے۔

ندیم اپل نامور صحافی ادیب اور کالم نگار ہیں۔ ان کا اصل نام محمد ندیم ہے لیکن ادبی دنیا میں ندیم اپل کی حیثیت سے معروف ہیں۔ آپ لاہور کے علاقہ نواں کوٹ کے ایک علمی گھرانے میں 28 دسمبر 1952 کو پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مقامی سکول میں حاصل کی اور 1973ء میں بی۔اے کا امتحان اعزاز کے ساتھ اول درجے میں پاس کیا۔ ان کا فطری رجحان صحافت کی طرف تھا چنانچہ انہوں نے سرکاری نوکری کی بجائے صحافت کو اپنا پیشہ بنا لیا اور پھر اس پیشے کو انہوں نے اپنی محنت سے باوقار بنا دیا۔

ندیم اپل کے اپنے صحافتی پیشے سے عشق کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ سرکاری ملازمت جو کسی بھی شخص کے لیے محفوظ معاشی تحفظ کی ضمانت ہوتی ہے انہوں نے 1980ء میں ایک پُرکشش سرکاری نوکری کو اپنے قلم کے شوق پر قربان کر دیا اور صرف قلم کے کھلاڑی بن کر رہ گئے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے صحافتی پیشے میں کبھی بد دیانتی نہیں کی۔ روزنامہ مغربی پاکستان سے روزنامہ مشرق تک ان کے صحافتی سفر کی داستان بہت طویل ہے۔ روزنامہ مغربی پاکستان، مساوات، امروز، نوائے وقت، صحافت، خبریں، انصاف، اوصاف، جرأت اور روزنامہ آفتاب کے علاوہ وہ ماہنامہ ویمن ٹائمز، خواتین ٹائمز اور سیارہ ڈائجسٹ کے ساتھ گزشتہ تیس سال سے وابستہ رہے۔ انہوں نے تقریباً ہر قومی اخبار اور جریدے میں مرکزی حیثیت میں پورے اختیار اور اعزاز کے ساتھ کام کیا تاہم آج بھی ملک کے معروف ادبی جریدے ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ میں گزارے پانچ سالوں کو وہ اپنے صحافتی کیریئر کا شاندار قرار دیتے ہیں جس دوران انہوں نے چار اولیائے کرام، ایک جہاد نمبر اور خلفائے راشدین نمبر مرتب کیے جو آج بھی دینی حلقوں میں خاصے مقبول اور ملک کی ہر لائبریری کی زینت ہیں۔

ندیم اُپل نے خود کو ادب و صحافت کی کسی ایک صف تک محدود نہیں رکھا بلکہ بیک وقت میگزین نیوز، انٹرویو، ڈرامہ، فیچر رائٹنگ، ترجمہ اور شاعری الغرض ہر میدان میں خود کو اس کا اہل ثابت کیا۔

معروف بزرگ صحافی پرویز حمید نے ایک بار ندیم اپل پر اپنے آرٹیکل میں یہ دلچسپ جملہ شامل کیا تھا کہ ندیم اپل 16 برس سے زائد عمر کی لڑکی کو آنٹی کہنا شروع کر دیتا ہے کے دل کی دھڑکن اور نبض کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ آج بھی ندیم اپل اپنے دوستوں سے ملنے کسی اخبار رسالے کے دفتر میں چلا جائے تو مرد حضرات کے علاوہ کچھ نسوانی آوازوں کی طرف سے انہیں عزت و تکریم کی الفاظ کا گارڈ آف آنر ضرور ملتا ہے جس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ندیم اپل نے اپنی رہنمائی کی چھتری میں آنے والے ہر طالب علم کو کچھ

نہ کچھ سکھایا ہی ہے۔ انہیں اظہر جاوید (مرحوم) کی طرح اس بات کا قطعی علم نہیں کہ شرافت کو دیکھتے ہوئے خود چھپنے کی شوقین لڑکیاں انہیں ڈھونڈ نکالتی ہیں۔

ندیم اپل کو شکوہ ہے کہ دنیائے کے صحافت میں جس قدر منافقت اور دوغلا پن ہے اس نے اس شعبے کو خاصا بدنام کر دیا ہے۔ مجھے اس حوالے سے انہوں نے ایک واقعہ سنایا کہ جب ان کی کتاب ''خبر قبیلہ'' کی تقریب رونمائی ہوئی جو ان کے بہت ہی پیارے لاڈلے اور چہیتے علامہ عبدالستار عاصم نے انتہائی خلوص اور محبت سے مرتب کی تھی اور اس میں ملک کے صحافتی مالکان اور معروف کالم نگاروں کے انٹرویو تھے، تو تقریب کے موقع پر کتاب میں شامل صحافتی شخصیات کو جب کتاب کی تقریب رونمائی میں شرکت کی دعوت دی گئی تو تقریباً سب نے یہی پوچھا کہ کتاب میں شامل فلاں کالم نگار یا فلاں ادیب تو نہیں آرہے اور اگر فلاں آئے گا تو میں نہیں آؤں گا۔ ندیم اپل کے بقول اس واقعہ سے انہیں اندازہ ہوا کہ یہ نام نہاد دنیائے ادب وصحافت کے دیوتا جو خود ایک دوسرے کو دیکھنے ملنے اور بات کرنے کے روادار نہیں وہ نفرتوں میں بٹی اور نفرتوں کے سمندر میں ڈوبی اس قوم کے افراد کو کیسے یکجا کریں گے۔

''شارجہ'' کے بین الاقوامی کتاب میلہ میں میرے پوتے ''بابر مقبول'' کو اس کی تالیف سٹوریز آف پرافٹس STORIES OF PROPHETS کو پوری دنیا میں بچوں کی بہترین کتاب کا ایوارڈ ملا۔ ندیم اپل نے بابر مقبول کی اس ایوارڈ یافتہ کتاب پر اپنے اخبار میں ایک فکر انگیز کالم لکھ کر اس غیر معمولی کارنامے کو سراہا اور بابر مقبول کو داد دی۔

..........☆☆..........

یونس جاوید

میں یونس جاوید کی کہانیاں پڑھتا اوران کے ڈرامے ٹیلی ویژن پر دیکھتا تو میرا جی چاہتا بچوں کی طرح تالیاں بجاؤں۔ بعد میں جب اپنی خواہش پر میں نے غور کیا تو احساس ہوا کہ ان کے مشہورزمانہ ڈرامہ ''اندھیرا اجالا'' نے جو خوشگوار اور مسرتوں اور قہقہوں سے لبریز تاثر پیدا کیا تھا وہی ان کے افسانوں پر بھی پھیل گیا تھا۔ حالانکہ ان کے افسانوں میں مزاح کی چاشنی بالکل نہیں ہوتی اور میں یہ بھی سوچتا کہ افسانوں کی کتاب ''تیز ہوا کا شور'' اور ''ربا سچیا رب قدیر'' کے قلم کار کے باطن سے ٹیلی ویژن کا بصری مزاح کیسے اُگ آیا ہے میں رشک کرتا کہ وہ لوگوں میں کتنی مسکراہٹیں تقسیم کررہے ہیں۔

اس تمہید کے بعد میں آپ کو اعتماد میں لے کر یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ قریباً تیس بتیس برس پہلے یونس جاوید مقبول اکیڈمی پر آئے تو میں نے انہیں کتابوں کا خریدار سمجھا انہوں نے سامنے کی کرسی پر بیٹھتے ہی پوچھا اے حمید کی نئی کتاب کون سی چھپی ہے؟ میں نے کتاب پیش کردی یونس جاوید نے اس کتاب پر درج شدہ قیمت دیکھ کر اپنا ہاتھ جیب کی طرف بڑھایا اور بتایا کہ میں بھی افسانے لکھتا ہوں اور میرے افسانے ''ادب لطیف'' میں چھپتے ہیں۔ میرا نام یونس جاوید ہے۔ یہ سب سن کر مجھے بڑی ندامت ہوئی کہ میں جسے کتاب کا خریدار سمجھ رہا تھا وہ اردو کے ایک اول درجے کے رسالے میں افسانے لکھ

رہا ہے اور پھر جب یونس جاوید بٹوہ نکال کر نوٹ گن رہا تھا میں نے گزارش کی کہ یونس جاوید صاحب اس کتاب کو میری طرف سے تحفہ سمجھئے۔ آپ نے اپنا تعارف دیر سے کیوں کرایا ہے؟ لیکن یونس جاوید صاحب قیمت ادا کرنے پر اصرار کرتے رہے آخر پچاس فیصد کم قیمت پر مک مکا ہو گیا۔ اور میں نے آدھی قیمت تبرک سمجھ کر قبول کر لی۔

یونس جاوید کی زندگی کا احوال بڑا عجیب ہے اس کے والد میاں عبدالحمید کی دکان انار کلی بازار میں تھی اور وہ اس زمانے کے غیر ملکی قلموں کا کاروبار کرتے تھے۔ پارکر، شیفر، مونٹ بلانک، پیلی کن، بلیک برڈ اور دیگر بے شمار قسموں کے امپورٹڈ پین اس دکان سے دستیاب ہوتے تھے جنہیں خریدنے کے لیے لاہور کے بڑے بڑے ادیب میاں صاحب کی دکان پر آتے ان میں ڈاکٹر سید عبداللہ، عابد علی عابد، احسان دانش، فقیر احمد فقیر، مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر عنایت اللہ جیسے لوگ شامل تھے۔ جنہیں یونس جاوید نے اپنے بچپن میں دیکھا اور ان کا عکس اپنے دل میں بٹھا لیا حالانکہ وہ ان کے مقام اور مرتبے سے واقف نہیں تھا۔ لیکن جب دیکھتا کہ ان میں سے کوئی عالم فاضل شخص دکان میں داخل ہوتا تو اس کے والد صاحب تعظیم سے کھڑے ہو جاتے۔ جھک کر مصافحہ کرتے اور جب تک وہ کرسی پر تشریف فرما نہ ہوتے، کھڑے رہتے۔ اس طرح یونس جاوید کے دل میں بھی ان کی تعظیم اور عزت کا جذبہ گھر کرتا گیا اور خود اس نے ادب میں نام پیدا کیا تو ان کے مقام اور رتبے اور عظمت و وقار کا سرا اپنے والد سے جوڑ لیا۔

یونس جاوید نے ابتدائی تعلیم کے لئے ایک انگلش سکول میں داخلہ لیا تھا۔ لیکن اس کے والد صاحب نے اسے انگریزی سکول سے اٹھا لیا اور اندرون شہر کی ایک مسجد میں قرآن کریم حفظ کرنے کے لیے بٹھا دیا۔ یونس جاوید نے اپنے والد صاحب کی خواہش کی تکمیل کی اور قرآن کریم حفظ کرنے کے بعد لاہور کی کئی بڑی مسجدوں میں رمضان شریف میں تراویح کی نماز میں قرآن سنایا۔ اس دور میں اسے کہانیاں پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا اور وہ اپنے گھر کے قریب اچھرہ میں ایک دکان سے ایک آنہ روز کرائے پر کتابیں لے کر پڑھنے لگا۔ جب وہ سولہ سترہ برس کا تھا تو ایک ستم رسیدہ افغان عورت ان کے گھر

آئی اوران کی والدہ کو اپنے دکھ درد کی کہانیاں سنانے لگی ۔ یونس جاوید بھی اس افغانی عورت کی درد بھری بپتا سنتا رہتا اور آخر ایک روز اس نے یہ سنی ہوئی کہانی ناول کی صورت میں لکھ ڈالی ۔ اس کا عنوان '' آخر شب '' رکھا جو ساٹھ کی دہائی میں چھپ گیا ۔ اس لحاظ سے یونس جاوید کی تخلیقی عمر نصف صدی سے تجاوز کر گئی ہے ۔ لیکن یہ یونس جاوید کے ادیب بننے کی داستان نہیں ۔ اسے ادیب تو اس کی '' ڈائری نویسی '' نے بنایا تھا ۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی بات اس کے مزاج کے خلاف ہو جاتی تو وہ اپنا احتجاج اپنی ڈائری میں درج کر دیتا ۔ اس طرح لکھنے کی عادت استوار ہوتی چلی گئی اور آخر اس کے اندر سے ایک بڑا ادیب نکل آیا جس کے جوہر افسانہ نگاری ، خاکہ نگاری اور ڈرامہ نگاری میں کھل کر سامنے آئے ۔

یونس جاوید کی ساری زندگی لاہور میں گزری ہے اس نے اپنے بچپن میں جن ادیبوں کو دیکھا تھا ان سے ملاقاتیں جوانی میں ٹی ہاؤس میں کیں ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے ہم عمر ادیبوں کو اپنے فن سے متاثر کیا ۔ یونس جاوید فطری طور پر اپنی بات منوانے کی کوشش نہیں کرتا لیکن اسے نظر انداز کر دیا جائے تو وہ بہت محسوس کرتا ہے ۔ اپنے ایک انٹرویو میں اس نے بتایا کہ '' ادب لطیف '' کے ایڈیٹر میرزا ادیب مری گئے تو رسالے کی ادارت اس کے سپرد کر گئے ۔ یونس جاوید نے موقع غنیمت جانا اور '' ادب لطیف '' کے آخری صفحات پر اپنی کہانی '' پاپا '' لگا دی ۔ میرزا ادیب ناراض ہو گئے اور مری سے ہی اپنا استعفیٰ بھیج دیا ۔ چودھری افتخار صاحب نے بڑی مشکل سے انہیں منایا لیکن اس کے بعد میرزا صاحب نے یونس جاوید سے کبھی افسانہ طلب نہ کیا مگر دوستی قائم رکھی ۔ احمد ندیم قاسمی کے بارے میں بھی ان کے خیالات ایسے ہی تھے کہ مجلس ترقی ادب میں ان کے معاون ہونے کے باوجود '' فنون '' کے لئے کبھی افسانہ طلب نہ کرتے وہ ادب میں دو گروہوں کا خصوصی ذکر کرتے ہیں ایک احمد ندیم قاسمی کا اور دوسرا وزیر آغا کا ۔ وزیر آغا ریڈیو پر اس کا افسانہ سنتے تو دوسرے دن دفتر آ کر داد دیتے اور '' اوراق '' میں اشاعت کے لئے لے جاتے ۔ حلقہ ارباب غالب میں یونس جاوید نے قاسمی صاحب کی موجودگی میں افسانہ

پڑھا تو انہوں نے بہت تعریف کی۔

یونس جاوید کی بیس سے زیادہ کتابیں جو افسانوں، خاکوں اور ڈراموں پر مشتمل ہیں چھپ چکی ہیں، اسے بے شمار ایوارڈ زمل چکے ہیں اس نے حلقہ ارباب ذوق پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی حاصل کی۔ مجلس ترقی ادب میں لمبا عرصہ قاسمی صاحب کی ماتحتی میں گزارا۔ قاسمی صاحب نے مجلس سے استعفیٰ دیا تو یونس جاوید کو مجلس کا ناظم بنا دیا گیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مجلس کی گورننگ باڈی میں ڈاکٹر انور سدید کا نام یونس جاوید نے شامل کرایا تھا اور قاسمی صاحب کو دوبارہ مجلس کی نظامت دی گئی تو یونس جاوید نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ انور سدید کی نامزدگی اسے مہنگی پڑی۔

اب ایک ذاتی بات سنئے میں ایک مرتبہ مجلس ترقی ادب میں یونس جاوید سے ایک کتاب کا مسودہ حاصل کرنے کے لئے گیا تو انہوں نے انکار نہیں کیا لیکن کتاب کا مسودہ بھی نہیں دیا، چنانچہ اس کی کوئی کتاب مقبول اکیڈمی سے نہیں چھپی اس کے باوجود ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ بلاشبہ یونس جاوید میرے عزیز ترین دوستوں میں شامل ہیں۔ خدا انہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ (آمین)

............☆☆............
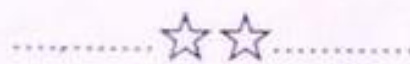
کوائف

ملک مقبول احمد

• • •

نام: ملک مقبول احمد

والد کا نام: ملک لال دین

تاریخ پیدائش: 22 جنوری 1930ء بروز بدھ

بمقام: دتیووال تحصیل پسرور ضلع سیالکوٹ

قبیلہ: اعوان

تعلیم: باجڑہ گڑھی اور رسول پور بھلیاں ضلع سیالکوٹ میں ورنیکلر مڈل تک۔

ملازمت: ٹیچرز ٹریننگ (نارمل) سکول نارووال میں ایک سال کی ٹریننگ کے بعد گورنمنٹ سکول کلوئے ضلع سیالکوٹ میں بحیثیت اوّل مدرس (ہیڈ ماسٹر) 2 سال ملازمت کی۔

ادارت: ☆ پندرہ روزہ ''چودھویں صدی'' لاہور تقریباً چار سال تک باقاعدگی سے شائع کیا۔ اس میگزین کے ادبی نگران احسان دانش صاحب تھے۔

☆ ماہنامہ ''نئے زاویے'' لاہور تقریباً ایک سال تک شائع کیا۔

عملی زندگی: ☆ رسالہ پندرہ روزہ ''چودھویں صدی'' لاہور/ 1956ء

☆ ماہنامہ ''نئے زاویے'' لاہور / 1957ء

☆ ''پی آئی بی سی پبلشنگ ہاؤس''/ 1957ء

☆ ''پی' آئی' بی' سی پرنٹنگ پریس''/ 1957ء

☆ ''بستان ادب'' پبلشنگ ہاؤس / 1954ء

☆ ''مقبول اکیڈمی'' پبلشرز، بک سیلرز/ 1957ء

☆ ''خورشید مقبول پرنٹنگ پریس''/ 1995ء

شادی: ☆ اپنے خاندان میں ہوئی۔

اولاد: ☆ دو بیٹے ڈاکٹر ظفر مقبول، ڈاکٹر ارشد مقبول اور ایک بیٹی ڈاکٹر شہنیلا وحید ہیں۔ تینوں ڈاکٹر ہیں (الحمدللہ)

☆ تینوں نے تھوڑا عرصہ گورنمنٹ سروس کی اور پھر میرے ساتھ پبلشنگ کے کاروبار میں شامل ہو گئے۔

تصنیفات و تالیفات:

1- ''سفر جاری ہے'' (خودنوشت) / 2007ء

2- ''پذیرائی'' (''سفر جاری ہے'' پر لکھے گئے مشاہیر کے مضامین)/ 2007ء

3- ''پیغمبر عالم ﷺ'' (سیرت)/ 2008ء

4- ''اہل قلم کے خطوط'' (مصنفین کے ادبی خطوط) / 2009ء

5- ''گلشن ادب'' (میگزین ''چودھویں صدی'' سے انتخاب) / 2010ء

6- ''گمشدہ افسانے'' (میگزین ''چودھویں صدی'' سے انتخاب) / 2010ء

7- ''ارمغان غزل'' (میگزین ''چودھویں صدی'' سے انتخاب) / 2010ء

8- ''نیا علم شفا بخشی'' (ڈاکٹر لوئی کوہنی کی کتاب کے اردو ترجمہ کی تلخیص) ،2010ء

9- ''سیاحت نامہ ترکی'' (سفرنامہ) ،2011ء

10- ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' (خاکے) ،2011ء

11- ''شناسائی'' (''سفر جاری ہے'' پر لکھے گئے مشاہیر کے مضامین) ،2011ء

12- ''آپس کی باتیں'' (ڈاکٹر انور سدید کے انٹرویوز کا انتخاب) ،2012ء

13- ''برسبیلِ گفتگو'' (ڈاکٹر انور سدید کے انٹرویوز کا انتخاب) ،2012ء

14- ''سفرِ آرزو'' (حج کا سفرنامہ مع تاریخی پس منظر) ،2012ء

15- ''تعلیماتِ قرآن'' (منتخب قرآنی آیات کا اردو ترجمہ) ،2012ء

16- ''ذوقِ نظر'' (پروفیسر جمیل آذر کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے مضامین کا انتخاب) ،2013ء

17- ''ادب شناسی'' (میری مرتب کتب پر لکھے گئے مشاہیر کے تبصرے) ،2013ء

18- انسائیکلوپیڈیا قائداعظم (ایڈیٹنگ) ،2013ء

19- شناسا ادبی چہرے (خاکے) ،2013ء

20- سرورِ کائناتؐ (سیرت) ،2013ء

تالیفات: جو شائع کر کے فی سبیل اللہ تقسیم کی جا رہی ہیں۔

1- ''پیغمبر عالم ﷺ''

2- ''خطبہ حجتہ الوداع''

3- ''احکام القرآن''

4- ''قرآنی دُعائیں''

5- ''رہنمائے حج و عمرہ''

6- ''تحفہ حدیث''

7- ''صلّو علیہ وآلہٖ''

اعزازات: ☆ ''قرآن وامن کانفرنس''، منعقدہ 20 فروری 2010ء میں رضویہ ٹرسٹ کا لائف اچیومنٹ ایوارڈ۔ (صدارت:- امیر محبت خان مری)

☆ قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کا علمی اور ادبی خدمات پر ''گولڈ میڈل'' (صدارت:- صاحبزادہ مفتی محمد وحید قادری)

☆ عظیم آرا فاؤنڈیشن کی طرف سے ''گولڈ میڈل'' (صدارت:- ڈاکٹر انور سدید)

☆ پاکستان رائیٹر گلڈز پنجاب کا ''ڈاکٹر عبدالقدیر خان ایوارڈ'' (صدارت:- ماجد یزدانی)

☆ علی اکبر گروپ آف انڈسٹریز کی طرف سے ادبی خدمات پر ''گولڈ میڈل'' (صدارت:- سعد اکبر خان)

☆ خودنوشت ''سفر جاری ہے'' پر ایک سو سے زیادہ مشاہیر اہلِ قلم نے بیش قیمت مضامین لکھے اور خراجِ تحسین پیش کیا۔

☆ مقبول اکیڈمی کے زیراہتمام اب تک ڈیڑھ ہزار سے زیادہ علمی، ادبی اور تاریخی کتب شائع کی ہیں (الحمدللہ)۔

☆ پروفیسر جمیل آذر نے اپنی کتاب ''راہ نوردِ شوق'' میں میری خودنوشت ''سفر جاری ہے'' پر ایک دلآویز، سادہ مگر پُرتاثیر طویل انشائی تنقیدی جائزہ پیش کیا۔

☆ ''نشاطِ سفر'' میری کتاب ''سیاحت نامۂ ترکی'' پر ایجوکیشن

یونیورسٹی لاہور کی طالبہ سیّدہ حلیمہ احمد نے ڈاکٹر عبدالکریم خالد کی زیرنگرانی ایم اے اردو کا مقالہ تحریر کیا۔

☆ میری کتاب ''سفر آرزو'' پر نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کی طالبہ طلعت فردوس نے ڈاکٹر فوزیہ اسلم کی زیرنگرانی ایم۔اے اردو کا مقالہ تحریر کیا

☆ مقبول اکیڈمی نے معروف ادیب ڈاکٹر انور سدید اور اے حمید کی سب سے زیادہ کتابیں شائع کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔

احسانات: ☆ میگزین ''چودھویں صدی'' کی اشاعت میں جناب احسان دانش نے میری رہنمائی کی۔

☆ مقبول اکیڈمی کے قیام اور کاروبار کے آغاز میں جناب رئیس احمد جعفری، جناب قمر نقوی، جناب احسان الحق سلیمانی، جناب عبدالعزیز خالد، مولانا حامد علی خان، پروفیسر رفیع اللہ شہاب، جناب میرزا ادیب اور جناب اے حمید نے میرے ساتھ پُرخلوص تعاون کیا۔

☆ ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر طارق عزیز، جناب علی سفیان آفاقی، پروفیسر جمیل آذر، جناب محمد آصف بھلی، جناب سعید بدر، جناب اظہر جاوید، ڈاکٹر صفدر محمود، جناب قاضی ذوالفقار احمد جناب ظفر علی راجا، سید واجد رضوی، سید قاسم محمود، ڈاکٹر تنویر حسین، پروفیسر سید شبیر حسین شاہ زاہد، محترمہ عذرا اصغر، محترمہ بلقیس ریاض، پروفیسر محمد مظفر مرزا، علامہ عبدالستار عاصم اور جناب ناصر نقوی نے ادبی

اور اشاعتی سفر میں اپنی گراں قدر معاونت سے سرفراز کیا۔ میں ان سب
کا شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے۔